# زرد کاغذ

کومل ذیشان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

# زرد کاغذ

## کومل ذیشان

پاک سوسائٹی کے تحت شائع ہونے والے ناول " زرد کاغذ " کے حقوق طبع و نقل بحق ویب سائٹ Paksociety.com اور مصنفہ (کومل ذیشان) محفوظ ہیں۔

کسی بھی فرد، ادارے، ڈائجسٹ، ویب سائٹ، ایپلیکیشن اور انٹرنیٹ کسی کے لئے بھی اس کے کسی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹیوی چینل پر ڈرامہ و ڈرامائی تشکیل و ناول کی قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر (پاک سوسائٹی) سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی اور بھاری جرمانہ عائد کرنے کا حق رکھتا ہے۔

# پیش لفظ

تم اس کائنات کا حصہ ہو بالکل ایسے جیسے درخت اور ستارے ۔تمہارا حق ہے یہاں ہونا۔میکس ایہرمن

کائنات کا مرکز وہ عظیم روح ہے اور وہ مرکز ہر کہیں ہے۔ہم میں سے ہر ایک کے اندر۔ بلیک ایلک

تم صرف ایک وجود نہیں بلکہ مرکزی نقطہ ہو وہ نقطہ جہاں کائنات باشعور ہے۔ ایکھارٹ ٹولے

"مجھے میرے ہونے کا احساس دکھ دیتا ہے۔۔۔" یہ شبد جانے کس کردار نے بولے تھے۔۔۔کسی مفتوح قوم کے فرد نے جس کی جنت کو ابھی ابھی تاراج کیا گیا تھا اس وقت جب سکندر اعظم ابھی ارسطو سے اخلاقیات ، علم اور فلسفے کا درس لیتا تھا اور اپنے باپ کو میسی ڈونیا کو ایک عظیم فوجی طاقت میں تبدیل کرتے دیکھ رہا تھا یاشاید تب جب ہلاکو خان انسانی کھوپڑیوں کو اپنے پاؤں تلے روندتا چلا جا رہا تھا تو کونیا میں داخل ہوتے درویش سے کسی مہاجر نے کہا تھا۔۔۔ دونوں ابھی وہاں نو وارد تھے۔درویش نر سنگھا بجا کر اپنی آمد کی اطلاع کر رہا تھا اور مہاجر درویش کے ہاتھ میں پکڑے ناریل کے پیالے سے زیادہ خستہ حال دل لیے ساتھ چل رہا تھا یاشاید یہ شبد ناگاساکی میں ایٹمی دھماکے کے بعد بچ جانے والی ایک چھوٹی بچی نے کہے تھے جسے کائنات میں شگاف ڈالتی دھمک نے لمحوں میں بوڑھا کر دیا تھا یا شاید کسی انجینیر نے برج دبئی کی ایک سو بارہویں منزل پر کھڑے کھڑکی سے باہر نظارہ کرتے ہوئے کسی بیلے ڈانسر کو کہے تھے جو ڈانس کے بعد ستانے کے لیے اچانک وہاں اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہونے کا احساس تو میرے خیال سے ان پہاڑوں کو بھی دکھ دیتا ہو گا۔" مخاطب کردار نے افق پر دیکھتے ہوئے گلہ کرنے والے سے کہا۔افق پر بادل تھے یا پہاڑوں کے سائے پتا نہیں چلتا تھا۔پرندے پر پھیلائے خوابوں کی صورت تیر رہے تھے۔

"آخر ان کو قیامت کے دن روئی کے گالوں کی طرح دھنک دیا جائے گا۔۔۔ تمہیں تو پتا ہو گا۔۔۔" گلہ کرنے والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

" پہاڑ انسان سے زیادہ ذی شعور ہیں۔۔۔ آخر انہوں نے لاکھ ہا سال پہلے اس بوجھ کو اٹھانے سے انکار کیا تھا جسے انسان نے خوشی خوشی قبول کر لیا تھا۔" مخاطب نے گلہ کرنے والے کو وضاحت دی تھی۔

"اور پھر دیکھو ناہونے کے دکھ کے باوجود وہ پیغمبر داؤد علیہ سلام کے ساتھ کس طرح تورات کی تلاوت کرتے جھومتے تھے۔۔۔اور یہ پرندے جنہیں ان کی ہلکی کھوکھلی ہڈیاں نہیں خدا کا اذن ہوا میں متوازن رکھتا ہے یہ بھی ہونے کے دکھ سے انجان تو نہ ہوں گے۔۔۔بڑے شکاری پرندے ان کی بوٹی بوٹی اڑا دیتے ہیں مگر کیسے یہ حکم ربّی بجالاتے ہیں۔۔۔اس کی محبت کے گیت گاتے

ہیں۔۔۔اور پھر ہونے کا احساس ابلیس سے زیادہ کس کو دکھ دیتا ہو گا جو اپنا انجام جانتا ہے مگر پھر بھی اپنے عمل پر کاربند ہے کیونکہ وہ شر کی تکمیل چاہتا ہے۔"

"میری کوئی چیز کامل نہیں ہے۔۔۔نہ محبت، نہ نفرت، نہ مشورہ، نہ، احسان، نہ نیکی نہ، بدی شاید خام ہونا مجھے دکھ دیتا ہے۔"اس کردار نے گویا ہونے کے دکھ کی وجہ ڈھونڈنا چاہی تھی۔ مخاطب کردار نے گہرا سانس بھرا۔

"اس ہونے کے درد کو اکھاڑنے کی کوشش نہ کرو۔"

"پھر کیا کروں۔۔۔؟"گلہ کرنے والے نے پوچھا۔

"اس کی افزائش ہونے دو جیسے پتھروں کی ہوتی ہے وہ پیدا ہوتے ہیں ڈھلوانوں پر لڑکتے ہیں، رگڑیں کھاتے ہیں۔۔۔کچھ گولائی اختیار کرتے ہیں، کچھ مادے جزب کر کے حجم بڑھاتے ہیں۔۔۔صدیوں افزائش ہوتی رہتی ہے۔۔۔بوڑھے ہونے لگتے ہیں مگر کمزور نہیں پڑتے۔بس۔۔۔اس ڈر سے رو پڑتے ہیں کہ جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں۔"

"اس سے کیا ہو گا۔۔۔"

"طور ہو جاؤ گے۔ آسمان میں تمہارے چرچے ہوں گے۔"مخاطب کردار بولا تھا۔

نہیں یہ کسی مفتوح قوم کے باشندے نہیں تھے، نہ کونیا کے کردار تھے اور۔۔۔ نہ یہ ناگاساکی میں بچ جانے والی کوئی بچی تھی۔۔۔ نہ یہ برج دبئی کی ایک سو بارہویں منزل پر کھڑا کوئی انجینیر اور بیلے ڈانسر تھے۔۔۔یہ تو تیمیہ اور سمیع تھے۔ہاں یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے تیمیہ کون تھی اور سمیع کون۔۔۔گلہ کس نے کیا تھا اور جواب کس نے دیا تھا۔۔۔شاید دونوں نے مختلف اوقات میں یہ دونوں کردار نبھائے تھے۔۔۔

"میں نے تیرہ سال کی عمر میں ایک بار خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"یہ بات تیمیہ نے اسے بتائی تھی بہت بعد میں۔

"کیوں۔۔۔؟"اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

"کیونکہ مجھے ہونے کا احساس تکلیف دیتا تھا۔"

سمیع نے یہ حرکت اس کے گزر جانے کے بعد کی تھی کیونکہ تب اسے بھی ہونے کا احساس دکھ دینے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"میں تمہیں صحیح سے سمجھا نہیں سکتی مگر کچھ ہے جو بے حد خوبصورت ہے۔۔۔جو ڈیوائن ہے۔۔۔میرے گمان میں ہے۔۔۔مم۔۔۔میرے یقین میں ہے۔۔۔جو صادقین کی مصوّری کی طرح ہے فوزیہ۔"

اور فوزیہ کی آنکھیں اس پر جھکے ہوئے، اس کی پیٹھ سہلاتے چھلک پڑی تھیں۔پانی حلق سے اتارنے کوشش میں وہ بری

طرح کھانس رہی تھی اور کھانسنے کے دوران بھی بول رہی تھی مسلسل بول رہی تھی۔ کیموتھراپی کے بعد کے کچھ دن وہ یونہی ہو جایا کرتی تھی۔۔۔ جیسے مونگ پھلی کا سرخ چھلکا۔

"جو۔۔۔ جو شاید اس کائنات کے مرکز کی طرح ہے۔" اس کے لہجے میں جسم کی کمزوری نمایاں تھی مگر وہ رک نہیں رہی تھی۔

"جووین گاف کے ذہن میں سمائی ستاروں بھری رات کی طرح ہے۔۔۔ دیوانِ شمس کی طرح ہے یا شاید۔۔۔ یا شاید اہرام مصر کی نوک پر چمکتے ستارے کی طرح۔۔۔" اس کا سانس بحال ہوا تو فوزیہ نے اسے ہلکا سا زور ڈال کر زبردستی لٹایا۔ اس کا دل چاہا ساتھ والے کمرے میں سوئی اس کی ماں کو جگا لائے آج وہ بے حد بے چین تھی مگر پھر نامناسب خیال کیا وہ سارا دن ہسپتال میں رہی تھیں بے حد تھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر سر سہلانے لگی جہاں بالوں کی تعداد اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

"کیا اتنے پیارے لوگوں کو حق ہے کہ وہ ایسی جان لیوا بیماری گلے سے لگا لیں۔" اس نے اس کا سر سہلاتے ہوئے سوچا۔

"نہیں ہرگز نہیں ایسے لوگوں کو تو قیامت تک زندہ رہنا چاہیے۔۔۔ جب تک خوشی کا ایک ایک قطرہ زندگی سے کشید نہ کر لیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

شام کی نیلی اداسی ہر چیز سے لپٹ کر روتی تھی، ٹنکی میں گرتے پانی کی آواز کے ساتھ، چھت کی سبز زنگ آلود گرل پر بیٹھے کوّے سے لپٹ کر، صحن کے سرخ فرش پر لیٹی، سفید شیڈز سے لٹکتی، کھڑکیوں سے جھانکتی اس نیلی اداسی نے اس کو بھی نیل و نیل کر دیا تھا۔ کتنی دیر سے وہ چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا کہ شام کی نیلاہٹ میں سیاہی گھل گئی، بلب کی زرد مدقوق روشنی صحن میں واضح ہو گئی اس نے بے اختیار گرل پر بیٹھے کوّے کو دیکھا وہ ابھی بھی وہیں موجود تھا اس کا طویل سایہ اس کے وجود پر پڑ رہا تھا دفعتًا اسے خیال آیا وہ تھا بھی یا یہ فقط اس کا وہم تھا۔۔۔

اور کوّے نے
حرکت نہیں کی
وہ ابھی تک بیٹھا ہے
وہ ابھی تک بیٹھا ہے
زردی میں
پالاس (حکمت اور جنگ کی دیوی) کے سینے پر

میرے دروازے کی چوکھٹ پر
اس کی آنکھوں میں
راکشس دکھتے ہیں
خواب زدہ
اور قندیل کی روشنیاں
اس کا سایہ بناتی ہیں
اور میری روح
اس سائے میں
تیرتی ہے وہ کبھی اوپر نہیں اٹھ سکے گی

اس کے ہونٹ ایڈگر ایلن پو کی نظم پڑھتے ہل رہے تھے۔ دور کہیں دھند کے پار ست رنگی روشنیوں کو منعکس کرتی سمندر کی سی سفیدیوں میں سیاہ پتلیاں ہلکورے لے رہی تھیں، سات سروں میں گندھی کھنکتی آواز میں کوئی یہ نظم گنگنا رہا تھا۔ پہلی دفعہ یہ نظم اس نے اسی کی آواز میں سنی تھی جو اس کی قسمت ٹھہری۔

ان دنوں کاروباری معاملات، پڑھائی سب کچھ التوا کا شکار تھے کبھی وقت دیتا اور کبھی دنوں ہر چیز سے غیر حاضر۔ وہ سستی اور بے دلی سے اٹھا مغرب کی اذان ہوئے بھی گھنٹہ گزر چکا تھا، حلق میں پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پاؤں گھسیٹتا اندر کمرے میں آیا اب ہفتوں وہ صفائی نہیں کر پاتا تھا ایک دن کی اور پھر ایسا بھولا کہ اگلی بار شدید مجبوری میں کچھ چیزیں جھاڑ لیں۔ اس وقت بھی ہر چیز گرد آلود ہو رہی تھی، شیشے پر، پلنگ پر، کرسی میز پر گرد کی موٹی تہہ تھی حتٰی کہ کولر پر بھی۔ اس نے گلاس میں پانی بھرا، پینے کے لیے سیدھا ہوا سامنے میز پر اسے کاغذوں کا بنڈل نظر آیا جنہیں وہ اتنی دفعہ پڑھ چکا تھا کہ اس کے لفظ اسے ازبر ہو گئے تھے ۔رات بھی انہیں لفظوں کو حفظ کرتے گزری تھی۔ ہاتھوں میں ارتعاش پیدا ہوا پانی کا گلاس لیکر وہ وہیں میز تک آ گیا۔ عنوان والا صفحہ موسیقی کے سمبلز (علامتیں) سے گہنایا ہوا تھا۔ اس نے انگلیاں ان پر ایسے پھیریں جیسے وہ بج اٹھیں گے۔ اسے شوق تھا جب بھی ہاتھ میں کاغذ ہوتے وہ موسیقی کے سمبلز بنانے لگتی تھی۔ یہ اس کی کتاب کا اصل مسودہ تھا جس کتاب کے پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچ چکی تھی۔ آٹھ مہینے کے اندر اندر اس کا دوسرا ایڈیشن آ چکا تھا۔ لوگ اس کے مصنف سے رابطے کے لیے بے چین تھے۔

"آپ اس کتاب کی مصنفہ کو ضرور یہ پیغام دیں کہ ایک مشہور ٹی وی چینل ان سے رابطہ کرنا چاہتا ہے۔" پبلشر نے اس

سے کہا تھا وہ بغیر کچھ کہے اٹھ آیا۔

کتاب کس نے تحریر کی تھی اس کی شناخت کہیں نہیں تھی، صرف نام تھا۔ کوئی رابطہ کرنا چاہتا تو پبلشنگ ہاؤس فون کرتا اور نامراد ہوتا کیونکہ پبلشر کا خود براہِ راست مصنفہ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ کوئی پتہ نکلواتا بھی تو زیادہ سے زیادہ سمیع تک پہنچ پاتا۔ اسی نے اس کی اشاعت کروائی تھی۔ سمیع کے گھر ڈاکیے کے ہفتے میں چار پانچ چکر لگنے لگے تھے وہ سارے خط بغیر کھولے دراز میں ڈال دیتا اب تک تین دراز بھر چکے تھے۔ اس نے پانی زہر کی طرح حلق سے اتارتے ہوئے ادھ کھلے دراز کو دیکھا جس سے خطوں کے لفافے باہر جھانک رہے تھے۔ کتاب کو جس نے تحریر کیا تھا وہ اس دنیا میں موجود نہیں تھی وہ سب کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کتاب اس کی موت کے بعد شائع کروائی ہے مگر اس کے ہونٹ کسی غیر مرئی طاقت نے سی دیے تھے، وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

اس وقت اس کی یاد کی حدت اتنی زیادہ تھی کہ دل دماغ ہر چیز بھڑ بھڑ جلتی محسوس ہو رہی تھی، حلق خشک رہتا تھا اور کچھ کہہ پانا ناممکنات میں سے لگتا تھا۔ فون مسلسل بج رہا تھا اس نے خط اندر دبا کر دراز بند کیا اور فون اٹھایا۔

"ہاں بیٹے ایڈریس لکھ لو۔" دوسری طرف تایا ابو تھے تیمیہ کے تایا ابو۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تیمیہ سے اس کی پہلی ملاقات تب ہوئی تھی جب وہ صرف گیارہ سال کا تھا۔ ان کے علاقے سے ملحقہ کالونی میں اس کے ابا تیمیہ کے تایا کے بیٹے کو پڑھانے جاتے تھے۔ انہیں اس مہینے فیس قبل از وقت درکار تھی وہ اسی سلسلے میں وہ وہاں گئے تھے اس کے ضد کرنے پر اسے بھی ساتھ لے گئے۔ وہیں پر اس نے اسے دیکھا تھا۔۔۔ پہلی بار۔ اسے وہ دن پوری جذیات کے ساتھ یاد تھا۔ راستے میں درختوں سے گرتے پتے پاؤں میں آتے چرمر کرتے تھے، خزاں کی دیوی اپنی لمبی پلکوں کو جھپکتی ان دونوں کو تکتی تھی، کچے لیموں سی زرد دھوپ میں سمیع ان کے گیٹ سے چپکا کھڑا تھا بابا اسے باہر ہی چھوڑ گئے تھے۔ اس کی نظر وہاں اپنی ہم عمر بچی پر پڑی۔۔۔ روئی سا سفید دھندلا دھندلا چہرہ سیاہ سکارف کے ہالے میں، گلابی فراک پہنے وہ زمین پر دوزانو بیٹھی تھی اپنے سامنے ڈھیر سارے بنٹے رکھے۔ کبھی ایک بنٹا اٹھاتی اور سورج کی روشنی میں اس سے پھوٹتے رنگوں سے لطف اندوز ہوتی پھر دوسرا۔ وہ یہ عمل بار بار دہرا رہی تھی اس کے اندر موجود نقوش کو سحر زدہ ہو کر دیکھتی وہ اسے اچھی لگی تھی بہت اچھی لگی تھی۔ اس کا دل چاہا کاش اس کی اس سے دوستی ہو جائے۔ وہ اس کے ساتھ ان بنٹوں سے کھیلنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں کر سکا ابا کے انتظار میں گیٹ کے پاس کھڑا اسے کھیلتا دیکھتا رہا۔ تیمیہ کو ان کے اندر کہکشاں نظر آتی تھی، رنگ، سیارے اور ستارے۔۔۔ اور سورج۔۔۔ دور کہیں ساز بجتا تھا پتہ نہیں وہ نے (ایک خاص قسم کی بانسری) کی دل کی گہرائیوں میں اترتی آواز تھی یا سرود کی دنیا سے ماورا کرتی کوئی لے یا ستار کی کوئی دھن جو دھیمے دھیمے بجتی کھیتوں میں گندم کی سنہری بالیوں پر وجد طاری کرتی تھی، پانیوں کو رقص پر مجبور کرتی

تھی، پتھر کی دیواریں جسے سنتے زندہ لگتی تھیں یا جنوبی قطب کے ویران برف زاروں میں گرتے سنو فلیکس (برف کے گالے) کی آواز یا سیاہ سمندر میں تیرتے ستاروں کی گردش کی آواز دل سے ہم آہنگ ہوتی، جنہیں سننے والا کوئی نہیں تیمیہ اسی کسی آواز کے حصار میں تھی اسے اپنے ارد گرد کی کوئی خبر نہیں تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ یہ بنٹے اسے ریحان نے کھیلنے کے لیے دیے تھے اس سے زیادہ خوبصورت چیز تو دنیا میں نہیں ہو سکتی کہیں اسے ایسا ہی لگا تھا۔

اس کے بعد کئی دفعہ سمیع نے اسے وہاں دیکھا، جب بھی ابا کسی کام سے اسے وہاں بھیجتے۔ بس وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ اس کا سکارف دوپٹے اور پھر چادر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سیاہ چادر میں لپٹی وہ ہمیشہ کسی نہ کسی چیز میں مگن نظر آتی تھی۔ پھر جب فیس بک پر ریحان کی پروفائل کے ذریعے اسے اس کا اکاؤنٹ نظر آیا تو ایک دم اس کا دل چاہا تھا اٹھ کر کمرے میں بھنگڑا ڈالے گو وہ اس کے ہونے سے بھی بے نیاز تھی اور وہ جیسے جنموں سے اسے جانتا تھا، اس تک پہنچنا چاہتا تھا، اس کا متلاشی تھا۔ اس نے حتی الامکان ہر وہ گروپ اور پیج جوائن کر لیا تھا جو تیمیہ نے کیا ہوا تھا کہ اس سے رابطے کا واحد ذریعہ صرف یہی تھا کہ وہ اس کے لکھے لفظ پڑھ لے بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا لکھا ہر لفظ پڑھ لے اور وہ جتنا پڑھتا جاتا تھا نشہ بڑھتا جاتا تھا۔ وہ دن میں کریانے کی دکان چلاتا تھا جو ابا نے آخری وقت میں بنائی تھی تاکہ اس کی فیس کا خرچہ نکال سکیں پھر وہ دار فانی سے کوچ کر گئے اور اس کی پڑھائی ادھوری رہ گئی۔ اب وہ ایم سی ایس کے اگلے سمیسٹرز کی فیسیں جمع کرنے اور کھانے پینے کا خرچہ نکالنے کے لیے یہ دکان چلاتا تھا ساتھ ایک آفس میں ٹائپسٹ کی جاب کرتا تھا اور رات کو ایف ایم ون اوون پر لائیو پروگرام کرتا تھا انہیں جابز پر فی الحال اس کی گزر بسر تھی۔ ابا سب خرچہ کیسے ہینڈل کر لیتے تھے وہ اکثر سوچتا۔ ماسٹرز مکمل ہوتے ہی وہ اچھی سی جاب کر لے گا اور ان سب کاموں سے اس کی جان چھوٹ جائے گی مگر اس میں ابھی وقت تھا کیونکہ فیس کے اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور وہ کبھی اتنا برائٹ طالب علم نہیں رہا تھا کہ سکالرشپ پر پڑھ لیتا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا قرضہ لے کر کوئی کاروبار شروع کر لے مگر کم ہمتی اسے یہ قدم نہیں اٹھانے دیتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گروپ میں کسی نے پوسٹ کی تھی،

If an alien in a galaxy 65 million light years away is looking at us through a telescope right now then they are looking at Dinosaurs.

(اگر کوئی خلائی مخلوق پینسٹھ لاکھ نوری سال کی دوری سے ٹیلیسکوپ کے ذریعے زمین کا مشاہدہ کر رہی ہے تو اس کو ڈائنا سارز چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔)

تیمیہ کسی کو اس کا مطلب سمجھا رہی تھی۔

"اگر وہ اس وقت زمین پر چلتی پھرتی چیزوں کا عکس دیکھ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے روشنی زمین سے پیسٹھ لاکھ نوری سال کا فاصلہ طے کر کے ان تک پہنچی ہے۔ زمین سے روشنی کے سفر کے آغاز میں جو اس وقت زمین پر تھا وہ بس وہی دیکھ سکتے ہیں جبکہ اس دوران زمین اپنے مدار میں گھومتی زمانے کی بھینٹ چڑھتی چلی گئی لیکن اس کا علم لاکھوں نوری سال فاصلے پر بیٹھی کسی خلائی مخلوق کو نہیں ہو سکتا۔۔۔ جیسے روشنی سورج سے زمین تک آٹھ منٹ بیس سیکنڈ میں پہنچتی ہے تو ہم آٹھ منٹ بیس سیکنڈ پرانا سورج دیکھتے ہیں۔۔۔ اگر سورج مدار سے غائب ہو جائے تو ہم آٹھ منٹ تک جان نہ پائیں۔ سو یہ سارے ستارے جو لاکھوں، اربوں نوری سال کی دوری پر چمکتے نظر آتے ہیں اصل میں ہم ان کا لاکھوں، اربوں سال پرانا عکس دیکھتے ہیں آسمان پر۔ اس وقت ان کے ساتھ کیا واقعات وقوع پزیر ہو رہے ہیں یہ ہم نہیں جانتے۔۔۔"

"ایسی کوئی ٹیلیسکوپ ہو سکتی ہے بھلا جو پینسٹھ لاکھ نوری سال فاصلے پر موجود ایک سیارے کی مخلوق دکھا سکے؟" اس سمجھانے کے دوران ارسلان احمد نامی لڑکا درمیان میں کود اتھا۔

"بے شک ناممکنات میں سے ہے۔۔۔ مگر اس مفروضے سے حقیقت تو سمجھی جا سکتی ہے نا۔" تیمیہ نے جواب لکھا۔

بات سائنس سے ہوتی ہوئی مذاہب تک جا پہنچی جیسا کہ انجیل اور قران میں اللہ کے ہاں کے دن کو زمین کے کئی ہزار سالوں پر محیط بتایا گیا۔

اور اب پوسٹ کیا تھی یہ تو سب تقریباً بھول چکے تھے کیونکہ تیمیہ احمد اور ارسلان محمود کے درمیان دھواں دار مباحثہ جاری تھا۔

تیمیہ نے آنسٹائن، سٹیفن ہاکنگ اور نہ جانے کن کن سائنس دانوں کی تھیوریز کی پٹاری کھول دی تھی۔ تھیوری آف ریلیٹیویٹی اتنی اسے سکول کی فزکس نہیں سمجھا سکی تھی جتنی پچھلے آدھے گھنٹے میں سمجھ آئی تھی۔

وہ کسی بت کی مانند اس کے کمنٹس کو گھور رہا تھا۔

"بگ بینگ (وہ دھماکہ جس سے کائنات وجود میں آئی) سے پہلے تھیوری آف ریلیٹیوٹی (آئن سٹائن کی تھیوری کہ وقت اور رفتار مطلق نہیں) اپلائی نہیں ہو سکتی میں مانتی ہوں۔" تیمیہ نے لکھا تھا۔

"ہر چیز بس فریکوینسی ہے، یہ نتیجہ جو اخذ کیا گیا ہے یہ بھی سائنس کل غلط ثابت کر سکتی ہے کیونکہ سائنس میں تو روز نئی دریافت، نئی بات ہوتی رہتی ہے۔۔۔ نئی سوچ، نئی تبدیلی۔ وہ دلیل دینے میں ناکام رہا تھا اب آئے بائیں شائیں کر رہا تھا۔

"لیکن میرا ماننا ہے جو باتیں آسمانی صحیفوں سے ثابت ہو جائیں وہ کبھی نہیں بدلیں گی۔"

"اچھا اگر ہر چیز میٹر۔۔۔ پارٹیکلز (مادے ۔۔۔ کے ذرات) سے بنی ہے تو بتاؤ یہ سایہ کس سے بنا ہے اور خواب؟" اس نے

کسی انگلش پلے کے ڈائیلاگ لکھے۔

"ہر چیز بشمول روشنی اور کشش ثقل کی پارٹیکلز میں وضاحت کی جاسکتی ہے۔"

"خواب کی بھی؟" حیرانی کا سمبل ابھرا۔

"Yes (ہاں)۔۔۔"

"اور سائے کی؟"

"Yes۔۔۔"

"اچھا۔۔۔ہاہاہا۔"

"Irrational (غیر منطقی)۔" تیمیہ کو غالباً غصہ آیا ہو گا اس نے چشم تصور سے دیکھا۔

"Sick (بیمار ذہن)۔" ارسلان محمود نے ٹائپ کیا۔

"ہہ!"

سمیع نے کمنٹس پڑھتے ہوئے بے چینی سے انگلیاں چٹخائیں۔

" تو یوں تو یہ بھی کہا ہے تمہارے crush نے کہ ہر پارٹیکل کا اینٹی پارٹیکل موجود (ہر ذرے کے مخالف چارج والا ذرہ۔۔۔مثبت واور منفی)۔ سٹیفن ہاکنگ نے اس کی بھی ہدایت دی ہوئی ہے Don't shake hands with your anti self (اپنے وجود کے مخالف عکس سے ہاتھ نہ ملایئے گا) ورنہ بھررررر۔" آگے بلاسٹ کا ایموجی تھا۔

"اچھا یہ بتاو ہمیں ماضی کیوں یاد رہتا ہے مستقبل کیوں نہیں۔۔۔؟" اب وہ اس کے مطالعے اور سمجھ کا معیار جانچ رہا تھا ۔تیمیہ جو کہ اب کمنٹ نہ دینے کا طے کر چکی تھی مجبوراً ٹائپ کرنے لگی۔

"کیونکہ وقت ایک تیر کی طرح ہے جس کا آغاز ایک نقطہ ہے اور وہ آگے کی طرف پھینکا جا چکا ہے۔۔۔وقت عروج سے زوال کی طرف ہے۔یہ سفر میں ہے۔۔۔ کائنات کے ساتھ سو جو گزرا ہے وہ یاداشت میں ہے جہاں پہنچنا ہے اگرچہ طے ہے کہ کہاں پہنچنا ہے مگر یاداشت میں نہیں۔

"ہاہاہا۔" وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

I think you should be two dimensional like cartoons.

(میرے خیال میں تمہیں صرف دو جہتی ہونا چاہیے جیسے کارٹونز ہوتے ہیں۔) اس نے سٹیفن ہاکنگ کی کتاب سے ایک اور حوالہ حوالہ دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس نے گھر سے باہر قدم رکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے عرصہ دراز خلا میں یا پانی میں تیر تا رہنے کے بعد کوئی زمین پر قدم رکھے، قدم بلاوجہ ڈگمگا رہے تھے، جسم توازن قائم نہیں رکھ پا رہا تھا۔ آسمان پر شفق کے بھیگے ہوئے سرخ سائے تھے وہ یونہی بکھرا بکھرا سا چلتا سڑک پر آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں مدھم مدھم سا عکس ابھرا سیاہ چادر میں لپٹا، آوازوں کا مدھم سا شور کہ دفعتًا پاس ایک چنگچی گزری اس نے سر اٹھا کر دیکھا پچھلی سیٹ پر بنی سنوری جھلمل کرتے لباس میں کوئی لڑکی بیٹھی تھی غالبًا کسی تقریب میں جا رہی تھی۔ چہرے پر میک اپ کی تہہ بھی اداسی کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔۔۔ چنگچی زن سے منظر سے غائب ہو گئی۔

کہیں وہ بادشاہ تخت نشیں۔۔۔

کہیں کاسہ لیے گدا دیکھا۔۔۔ سڑک پر عابدہ پروین کی آواز گونج رہی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گروسری سٹور کے سامنے جا رکا جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے جھک کر کپکپاتے ہاتھوں سے مٹی میں کسی کے قدموں کا لمس محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پاس سے گزرتی گاڑی میں سے کسی نے جلتا سگریٹ سڑک پر پھینکا تھا جو اس کے قریب آ کے گرا وہ سیدھا ہوا اور پاؤں سے اسے مسل دیا۔ آنکھوں میں پھر ماضی کے سائے ہلکورے لینے لگے۔

لمبی سیاہ چادر کا پلو تیز قدم اٹھانے کے باعث پیشانی پر دھیرے دھیرے لرز رہا تھا، سفید پیشانی پر سیاہ پلو اسے رات اور دن کے ملن کا گمان ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کا مرکز قدموں کے نیچے بچھی سڑک تھی، ہر تھوڑی دیر بعد پلکوں کی جھالر اٹھتی اور وہ سامنے نگاہ کرتی مبادا کسی سے ٹکرا نہ جائے۔ ہاتھوں میں گروسری کا سامان تھا، کچھ سبزیاں لفافوں سے جھانک رہی تھیں، پالک کے پتے، توریاں، ٹماٹر۔۔۔ سمیع کو چند لمحے لگے تھے اسے پہچاننے میں اور انہیں چند لمحوں میں وہ اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ بھی لے چکا تھا۔ اس تک پہنچنے سے پہلے اس نے اپنی رفتار دھیمی کر لی۔ کھمبے کی تاروں سے کوّے نے اڑان بھری، سبزی والا ریڑھی پر پڑی سبزیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کرتا کرتا دھیرے دھیرے پرانا پاکستانی گیت گنگنا رہا تھا۔

میرے دل دے شیشے وچ سجنا پئی سجدی اے تصویر تیری

مینوں رب نے بنایا تیرے لئی۔۔۔

پانی بہہ بہہ کر کچی مٹی پر گرتا مشک مچا رہا تھا، سفید اور سرخ گاڑی اس دوران پاس سے گزریں سرخ گاڑی سے نکلتا سیاہ دھواں ماحول کو سوگوار کر رہا تھا اور سفید گاڑی کے ہارن کی آواز سوگواری کو جلا بخش رہی تھی۔ جب تک وہ اس کے سامنے پہنچا سامنے بیٹھا موچی دونوں جوتے گانٹھ چکا تھا۔۔۔ وہ رک گیا۔

"اسلام و علیکم۔" اس کے یکدم سامنے آ کر سلام کرنے پر وہ تھمی تھی، جھالر اٹھی سمندر آنکھوں میں حیرانی سے مدوجزر

پیدا ہوا۔

"Sorry (معذرت)۔" اسے لگا کسی نے غلطی سے رباب کا تار چھیڑ دیا ہو۔

"میں آپ کو نہیں پہنچانتی۔"

"نہیں" بولنے میں واضح گریز تھا اور لہجے میں تھوڑی گھبراہٹ کا عنصر۔ وہ تان سین کے کسی راگ کا کومل سر تھی۔۔۔ وہ سنسکرت کے دو چشمی حے کی طرح تھی یا شاید نون غنہ کی طرح۔۔۔ سارے منظر میں موجود تھی، بہت اہم تھی مگر کوئی اس کی اہمیت سے واقف نہیں تھا۔

"میں محمد سمیع معظم الدین۔" اس نے تھوڑا شرمندہ ہو کر اپنا فیس بک آئی ڈی بتایا۔

"اوہ۔۔۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"مگر آپ مجھے پہچانتے کیسے ہیں؟ پریشانی ہنوز برقرار تھی۔ اس نے قدم دوبارہ اپنی منزل کی جانب بڑھا دیے تھے وہ پہلی بار یوں اکیلے گھر سے باہر نکلی تھی وہ بھی تایا ابو سے شرط جیتنے کے چکر میں مگر اب شدید پزل ہو رہی تھی۔

"کیونکہ آپ کے تایا کے گھر میرا آنا جانا رہتا۔۔۔"

"ہنہ۔۔۔ آپ ہی وہ ہیں جو کل سے اب تک میرا ہر کمنٹ لائک کر چکے ہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی تھی۔ اس کی سانسوں کی مدھم مدھم آواز۔۔۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"وہ لائک کرنے کے قابل تھے۔۔۔ اس لیے۔" اس نے اپنا دفاع کیا تھا مبادا وہ اسے بلاوجہ لڑکیوں کے پیچھے پڑ جانے والوں کی لسٹ میں شامل کر لے۔

I was astonished (میں حیران تھا) کہ آپ نے کس طرح ترکی بہ ترکی جواب دیکر اسے چپ کروایا۔ Theory of relativity,

Creation out of nothing (تخلیق کی ابتدا بغیر کسی چیز اور نمونے کے) کمال کر دیا آپ نے۔"

مسکان کی عمیق لہر سے گلابی کشتی ڈگمگائی تھی۔ "آپ کو تو سارے کمنٹس ازبر یاد ہیں۔"

"وہ یاد رکھے جانے کے قابل تھے۔"

"اوکے۔۔۔ میں اب چلتی اسے غالباً احساس ہوا تھا کہ وہ ایک اجنبی سے سرِ راہ بات کر رہی ہے۔"

"اللہ حافظ محمد سمیع معظم الدین۔" کچھ قدم چلنے کے بعد ہلکا سا رخ موڑ کر کہا تھا۔

تینوں محرم دل دا جان لیا

دلبرا میرے ہان دیا

ہن تیرے ہتھ تقدیر میری

وہ وہیں کھڑا اس کو تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

میرے نین پیاسے درشن دے

تینوں رج رج سجناں ویکھن گے

تینوں تکدیاں ہووے اخیر میری۔۔۔

وہ گھر کی طرف پلٹ گیا تھا، پیچھے سبزی والا ابھی تک گنگنانے میں محو تھا۔

اس کے بعد تیمیہ سے اس کی ملاقات کئی ہفتوں کے بعد ہوئی تھی۔ گو وہ روز اسی وقت بازار جاتا کہ شاید آج وہ پھر سر راہ کہیں مل جائے مگر وہ اس دن کے بعد اسے کبھی بازار میں نظر نہیں آئی۔ فیس بک پر اگرچہ اس نے اس کی فرینڈ ریکویسٹ قبول کر لی تھی۔ وہ روز کی طرح اس کے انتظار میں بیوقفوں کی طرح کھڑا تھا کہ اس کے تایا ابو وہیں سے نمودار ہوئے جہاں اس نے اسے دیکھا تھا اس سے قبل کے پیچھے سے اندھا دھند آتی موٹر سائیکل ان کو زمین بوس کرتی سمیع نے انہیں تیزی سے تھام کر پیچھے کیا۔ انہوں نے اس اچانک افتاد پر گھبرا کر اسے ہی تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ جو اچانک اس کے پکڑنے پر گھبرا گئے تھے وجہ جاننے کے بعد بے حد شرمندہ ہوئے تھے۔

"ارے نہیں کوئی بات نہیں میں سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے چار دن سے پہنی شرٹ کے بازو سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ جن دنوں وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتا تھا اس کی حرکتیں بھی بیہیوں والی ہو جاتی تھیں۔

"شکریہ میاں کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی سمیع معظم الدین۔" وہ تھوڑا چونکے تھے۔

"اور کہاں رہتے ہو؟"

"جی یہیں پچھلے محلے میں۔"

"معظم الدین کے بیٹے ہو۔۔۔ جو سکول ٹیچر؟"

"جی۔۔۔ جی ہاں۔" ان کی بات ختم ہونے سے پہلے جلدی سے بولا تھا۔

"ارے برخوردار کیسے ہیں تمہارے والد؟ ریحان کو پڑھانے آیا کرتے تھے پھر جب ریحان کالج اور پھر باہر چلا گیا تو رابطہ

ٹوٹ گیا بہت اچھے انسان تھے۔"

"جی ان کی آٹھ سال پہلے وفات ہو گئی۔" وہ خاموش سے ہو گئے۔

اس دن نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے گو کہ وہ ایک سیکنڈ سے پہلے ان کے ساتھ ہو لینا چاہتا تھا

۔

"پتہ نہیں وہ ابھی بھی موجود ہو گی یا اپنے گھر جا چکی ہو گی۔"

گہری سبز نم بیلیں باہری دیواروں پر لپٹی تھیں۔ چوکیدار کے دروازہ کھولنے پر سب سے پہلے بوگن ویلا نے خوش آمدید کہا پھر چھوٹے سے بوٹنیکل گارڈن میں سے گزر کر گھر میں داخل ہوئے اور اندر داخل ہوتے ہی ان دیکھی چمک نے آنکھیں خیرہ کر دی تھیں، تیمیہ ہاتھوں میں کوئی پودا تھامے کمرے سے نمودار ہوئی دونوں ساکت ہوئے تھے۔

"فضل کو کہو چائے کا انتظام کرے۔"

"جی تایا ابو۔" وہ کہتے ہوئے پلوں میں وہاں سے غائب ہوئی تھی اور وہ سرشار سی کیفیت میں ٹی وی لاؤنج میں ان کے صوفے پر براجمان۔

"میرے بھائی کی بیٹی ہے اس کی وجہ سے ہی گھر میں ہر پل رونق ہے۔" اس نے بے اختیار اس سمت دیکھا جہاں وہ ابھی نظر آئی تھی اور زیر لب مسکرایا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تایا ابو جاب کی نوعیت کی وجہ سے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ بحری سفر میں گزارا تھا سو اپنی گفتگو میں ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اس نے دو تین کتب بحری سفر کی پڑھ ڈالی تھیں اور نتائج اس کی مرضی کے حاصل ہوئے تھے یعنی انہوں نے بطور سامع اور تقریباً ایک دوست کے کچھ عرصے میں اسے قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ریحان لندن میں آرتھوپیڈک سرجن بن رہا تھا سو تنہائی اور فراغت ان کے دو مسائل تھے۔ تیمیہ اس کے خیال کے مطابق ان کی تنہائی کے باعث یہاں رہ رہی تھی یا شاید تعلیمی سلسلے کی وجہ سے وہ صحیح اخذ نہیں کر پایا۔

"کرتے کیا ہو؟" یہ تیسری ملاقات تھی جب انہوں نے اس سے سوال کیا۔

وہ گڑبڑا کے رہ گیا۔ "جی۔۔۔ میں جی۔۔۔ میں بہت جلد ایم سی ایس میں داخلہ لینے کا۔۔۔ سوچ رہا ہوں اور ایف ایم ون او ون پر آر جے ہوں۔"

"ہنہ۔۔۔ لیکن کرتے کیا ہو جاب وغیرہ؟

"ٹٹ۔۔ٹائپ رائیٹنگ۔۔۔ایک جگہ۔۔۔"وہ اٹک اٹک کے دھیمے لہجے میں بولا تھا وہ کسی صورت کریانے کی دکان کے متعلق نہیں بتانا چاہتا تھا۔

"رائیٹر ہو؟"اس کی مبہم آواز اور اٹک اٹک کر بولنے کی وجہ سے ان کو شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی تھی۔ابھی وہ بھاگ جانے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ بجلی دغا دے گئی اندھیرا گھر سے زیادہ اس وقت اس کے چہرے پر پھیلا تھا کہ خوشبو کا جھونکا آیا ساری فضا معطر ہو گئی۔شاہ بلوط سے بنا فرنیچر موم بتیوں کے چھوٹے چھوٹے لرزتے شعلوں کی روشنی میں دمکنے لگا،سامنے پڑا قد آدم آئینہ مزید بڑا دکھنے لگا،ڈیکوریشن کے غرض سے رکھے طلائی پیالے ارتعاش میں آگئے وہاں اس کا سیاہ آنچل لہرا رہا تھا،وہ کھڑی فانوس میں موم بتیاں جلا رہی تھی۔

ست دریا اتھے یک قطرہ ست دوزخ چنگھاری
اٹھ بہشت ہوئے گم سارے تاں بک پھول بہاری

(جہاں تمام سمندروں کا پانی بس ایک بے قیمت قطرہ کی مانند ہے اور دوزخ کے ساتوں طبق محض ایک چنگاری کی اہمیت رکھتے ہیں)

سمیع کے منہ سے بے اختیار سیف الملوک بہہ گئی تھی۔

لاکھ ملائک نوری غم نھیں وانگ پتنگاں جلیا
تاں ہک آدم خاکی والا روشن دیوا بلیلا

اس مقام پر لاکھوں نوری فرشتے غم کی آگ میں پتنگوں کی صورت جل کر خاکستر ہوئے تھے تو تب جا کر آدم خاکی والا روشن فروزاں ہوا تھا۔

جواب میں تیمیہ کی آواز اور نگاہ نے اسے ساکت کر دیا تھا وہ میاں محمد بخش سے واقف تھی وہ سیف الملوک جانتی تھی۔ مگر اگلی آواز تایا ابو کی تھی۔

نویں پرانے،چنگے مندے ایتھے قدر نہ کائی
خواہے گریہ زاری کیجے،خواہے کرو نہ بھائی
جے کر سب جہان محمد بھجن مثل کبابے
اس منزل وچ معلم ہوندا وانگ خیالے خوابے

(قدیم جدید اچھے اور برے کی یہاں کوئی قدر و منزلت نہیں اس مسئلے پر جی کرے تو رو لو اور اگر جی کرے تو مت رو کوئی

فرق نہیں پڑنے والا، محمد مخش اگر اس مقام بے پرواہی پر ساری کائنات کو کباب کی صورت بھن جائے تو بھی بے پرواہی کی اس منزل پر یہ عمل کسی خواب اور خیال جیسی ناپائیدار چیز سے بڑھ کر معلوم نہ ہو گا۔)

اور یہ ان تینوں کی دوستی کا نقطہ آغاز تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"تیمیہ کو لکھنے کا بے حد شوق ہے، مجھے اس میں ایک بہت منجھا ہوا سنجیدہ لکھاری نظر آتا ہے جو خود اپنے ہونے سے انجان ہے اور میں چاہتا ہوں تم اس میں میری اور اس کی مدد کرو۔" انہوں نے کچھ دن بعد اسے خود گھر بلوایا تھا۔

"اس کے گھر والے تو بالکل اجازت نہیں دیں گے مگر میری یہ شدت سے خواہش ہے کہ اس کا یہ ہنر ضائع نہ ہو بلکہ تکمیل کو پہنچے اور اس میں تمہاری مدد درکار ہے۔" گو وہ اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے مگر وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا۔۔ کیا اس سے بڑی کوئی تمنا تھی اس کی کہ وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارے اس کی رہنمائی کرے، مدد کرے، اس کا خواب کی تکمیل میں اس کا ساتھ دے اس نے فوراً حامی بھری تھی۔ ادب سے اس کا تعلق کچھ اتنا کچا بھی نہیں تھا اس کے والد ٹیچر تھے کتابوں سے اس کا لگاؤ فطری تھا، اس نے زندگی بھر گھر میں یہی ماحول دیکھا تھا سو وہ کچھ نہ کچھ حد تک اس کی مدد کر سکتا ہے اس نے سوچا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس دن وہ کمرہ اس نے پہلی مرتبہ اندر سے دیکھا تھا جس کا بھاری لکڑی سے بنا منقش سنہرا دروازہ باہر لان میں کھلتا تھا۔ دروازے کے دائیں جانب پنجرے میں مصنوعی طوطا تھا جسے آتے جاتے اکثر بند دروازے کے ساتھ وہ دیکھنے کا عادی تھا۔ تایا ابو سے ملنے کے بعد انہی کی ہدایت پر آج ملازم اسے لائبریری کے دروازے تک چھوڑ گیا تھا۔ وہ دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ دروازہ فوزیہ نے کھولا تھا وہ اس گھر کی خاص ملازمہ تھی۔ خاص طور پر تیمیہ کے ساتھ اس نے ہر پل اسے سائے کی طرح دیکھا تھا۔ دروازہ کھول کر فوزیہ کونے میں رنگ برنگے دھاگوں، کترنوں اور کپڑوں کے درمیان دوبارہ جا بیٹھی اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ وہ جو وہیں سامنے کرسی کے باوجود زمین پر کشن کے سہارے بیٹھی کتاب میں گم تھی چونکی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سنہری روشنی سے بھرے کمرے میں ہوتی اس کے آنچل کی سرسراہٹ تھی یا کتابوں کی بھینی خوشبو کا سحر وہ کتنی دیر ہل نہیں پایا۔ وہ اٹھ کر میز کرسی تک آئی تھی۔

"اس قدر قیمتی خزانہ چھپا کر رکھا ہے آپ نے۔" اس نے تاثرات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فوزیہ نے ایک نظر سمیع کے چہرے پر ڈالی، دھیمی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا جیسے اس کے کسی اندر کے راز سے واقف ہوئی ہو اور پھر

واپس اپنے کڑھائی کے ٹانکے میں الجھ گئی۔

"یہ خزانہ میرا تو نہیں۔" پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تیمیہ نے جواب دیا تھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ سب کتابیں تو تایا ابو اور ریحان کی ہیں۔ میری کتابیں تو بس وہ سامنے۔۔۔" اس نے ہاتھ سے اپنی چھوڑی نشست کی طرف اشارہ کیا جہاں جہاں اوپر دیوار پر ونسینٹ وین گاف کی ستاروں بھری رات کی پینٹنگ ٹنگی تھی اور نیچے شیشے کا چھوٹا سا شیلف تھا۔ وہ بے اختیار اس طرف بڑھ گیا۔ شیلف میں تین قطاروں میں کتابیں پڑی تھیں، چاند پکھراج کا، کلام شیو، ٹوٹے ہوئے پر، گرینڈ ڈیزائن، بک تھیف اور فورٹی رولز آف لو وہ پہلی قطار میں پڑی کتابیں ہی دیکھ سکا تھا۔

"آپ کے گھر میں بھی تو ایسی ہی لائبریری ہو گی یا شاید اس سے خوبصورت۔" سامنے والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

"اس کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں ہے ہاں شاید ان کتابوں سے ایک صندووق بھرا جا سکتا ہے۔۔۔ بس اتنا ہی پڑھ پائی ہوں میں۔"

"کیا Qualification (تعلیمی قابلیت) ہے آپ کی؟" عرصے سے دل میں دبا سوال آج زبان پر آیا تھا۔ اس کے سوال پر وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔ ہوا کی سانس میں اس کی سانس گھلی تھی ہوا مہک رہی تھی، چھت سے لٹکتے سنہرا فانوس ارتعاش میں تھا۔

"ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے۔۔۔" بلا آخر وہ بولی تھی، دقت سے بولی تھی۔ اس نے اس کے جواب پر اچھنبے سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کے پاس کم از کم ماسٹرز کی دو تین ڈگریاں تو ضرور تھیں جس طرح کی اس کی معلومات اور گفتگو تھی، جس طرح اسے تین زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

"یقین کریں مجھے یقین نہیں آیا۔" اس کے چہرے پر غمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے میٹرک کی بھی نہیں۔" وہ بت بن گیا تھا۔

"گھر آ کر ایک معلم بچپن میں اردو، میتھ، سائنس اور انگلش پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے بہت ضد کی مگر ابا نہیں مانے پھر بھائی سے پڑھا مگر امتحان تو کوئی بھی نہیں دیا اجازت نہیں تھی۔ اب تک بس مانگے کی اور بھیک میں دی گئی تعلیم پر ہی گزارا کرتی آئی ہوں۔" وہ جواب میں کچھ بول نہیں سکا تھا۔

"میں کوئی نامور یا پختہ لکھاری نہیں ہوں۔۔۔" اسے خیال آیا اسے بھی اپنا تعارف دینا تھا جھوٹا تعارف۔

"میں آپ کی مدد کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔۔۔ میری تحریریں کبھی۔۔۔" وہ گلا کھنکار کے بولا مبادا وہ اس سے

منگوا کر پڑھنے کی فرمائش نہ کر دے۔۔۔

"آپ خوامخواہ میں اتنا تفصیلی تعارف دے رہے ہیں۔" ملال میں ہنسی شامل ہوئی تھی۔

"یہ تو تایا ابو کی محبت ہے ورنہ سچ پوچھیں تو میرے پاس کچھ ہے نہیں یہاں کرنے کو سو لکھتی رہتی ہوں۔ انہوں نے کہیں سے ایک آدھ چیز پڑھ لی اور اخذ کر لیا کہ مجھے اس فیلڈ میں آگے بڑھنا چاہیے ورنہ اگر میرے گھر والوں کو پتہ چل گیا تو قتل ہونے کے پورے چانسز ہیں۔"

"اچھا اچھا بولیں بی بی۔" فوزیہ بلبلائی تھی۔

"میں تایا ابو کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتی تھی اور سوچا کچھ سیکھنے کو مل جائے گا ٹائم پاس ہو جائے گا سو آپ بغیر کوئی بوجھ دل پر لیے تھوڑی بہت رہنمائی کر دیں۔ پھر ہم یہ کلاسز ختم کر دیں گے اور تایا ابو بھی مطمئین ہو جائیں گے۔"

"میرا ایک سوال ہے آپ سے۔۔۔ کہ کوئی انسان لکھتا کیوں ہے؟"

وہ بغیر جواب دیے اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھو گئی تھی۔

"اس لیے کیونکہ اسے سیکھنا ہے، جیسا کہ قران میں ہے الذی علم بالقلم۔۔۔" اس نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا تھا۔

"دوسرا یہ ذریعہ ہے ایک ساتھ بہت سارے لوگوں سے گفتگو کرنے کا۔۔۔ ان تک اپنی رائے پہنچانے کا اور۔۔۔" خاموشی کا مختصر وقفہ آیا۔

"اکثر ایسے محسوس ہوتا ہے میرا دل بھر بھری مٹی ہے۔۔۔ ایسے لگتا ہے اس نے اس میں ہزاروں ننھے ننھے بیج ڈال کر مجھے اس دنیا میں بھیج دیا ہے اور اب وقتاً فوقتاً جب ان کے پھٹنے کی باری آتی ہے مجھے تکلیف ہوتی ہے شدید۔۔۔ ان کے اندر سے نکلنے والی خیالوں کی کونپلیں مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہیں اور جب میں لکھتی چلی جاتی ہوں تو مجھے عجیب سی سرشاری محسوس ہوتی ہے۔" وہ ساکت اسے سن رہا تھا اس کی گھبراہٹ کو جانچ رہا تھا، اس کے شعور میں سالوں سے پنپتے کسی درد کی جھنکار اس کی آواز میں شامل تھی۔ فوزیہ بھی کڑھائی کا ٹانکہ بھولے منہ کھولے اسی کی طرف متوجہ تھی۔

"واہ۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"آپ تو۔۔۔" وہ بھی جیسے ہوش میں آئی تھی۔

"خیر یہ تو بس ایسے ہی۔۔۔" وہ شرمندہ ہوئی وہ کچھ نہیں بولا۔

"پہلا سبق میں آپ کو جو آج دوں گا وہ یہ ہے کہ اگر آپ کو لکھنا ہے تو پہلے خود کی اس صلاحیت کو قبول کر لیں، خود کو بطور لکھاری قبول کر لیں۔۔۔ کسی منزل تک پہنچنا ہے تو اس منزل کے مسافر کے طور پر تو خود کو قبول کرنا ہی ہو گا نا

۔۔۔اور پھر اس کو شب بیداریاں دیں۔" وہ اپنے والد کی کہی برسوں پرانی بات دہرا رہا تھا۔

"اور یہ تو آپ جانتی ہوں گی خواہ کوئی بھی فن ہو بنا سوز پیدا ہوئے، آنکھ نم کیے یا بغیر ایثار کیے معراج تک نہیں پہنچ سکتا۔ "فوزیہ نے گہری سانس لیکر ان جڑواں اروح کو دیکھا تھا جو وقت کے مختلف دائروں میں مقید ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تیمیہ کو بلڈ کینسر ہے اس بات کا پتہ اسے دو ماہ بعد لگا۔اس وقت اسے اس کے یہاں قیام کی وجہ سمجھ میں آئی تھی وہ یہاں تایا ابو کی تنہائی بانٹنے نہیں علاج کے غرض سے آئی ہوئی تھی اور چونکہ علاج لمبا تھا تو وہ خود ہی ٹھہری تھی گھر والے ہر کچھ عرصے بعد اس سے ملنے آجاتے تھے یا وہ چلی جاتی تھی۔

سب کچھ ویران ہو گیا تھا سیاہ اور ویران۔مایوسی اور غم اس کے اندر قدیم دراڑ زدہ دیوار میں سے رستے پانی کی طرح ٹپ ٹپ قطروں کی صورت گر رہا تھا، بہہ رہا تھا۔اس دن اس نے جانا کہ اندرونی کیفیت کس طرح ہر چیز کو بدل سکتی ہے، بدل دیتی ہے کھمبے، چڑیاں، گلیاں، لوگ ہر چیز دھبوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔وہ سر جھکائے گھر میں داخل ہوا جیکی گلی میں پھرتا آوارہ کتا جو روز اس کے دروازے کی چوکھٹ پر سوتا تھا اس دن توجہ نہ دینے پر بھونکنے لگا مگر اس کی پکار بھی اسے متوجہ نہیں کر پائی اس نے اندر آ کر دروازے کو سختی سے بند کر دیا صحن میں اندھیرا پھیلا تھا۔آج بہت دیر کر دی آنے میں اچانک باورچی خانے کی زرد روشنی میں اماں کا چہرہ ابھرا اور غائب ہوا۔

"ہاں بہت دیر کر دی آنے میں۔" وہ بڑبڑایا تھا۔ستارے آسمان کے آنسو ہیں، کرنیں چراغوں کی، رنگ دنیا کے ہر چیز آنسو ہے۔اس کے ساتھ آج دو ماہ ہو گئے تھے اس سارے عرصے میں پتا نہیں اس نے زیادہ سیکھا تھا یا سمیع نے طے کرنا مشکل تھا۔جب تایا ابو نے پہلی تاریخ کو فیس ہاتھ میں رکھی تھی وہ انکار نہیں کر سکا تھا کہ اس کا جواز اس کے پاس موجود نہیں تھا، جھجھک اور خوف کہ وہ کہیں اس کا گھر میں داخلہ منقطع نہ کر دیں۔

آج اس نے ٹیوشن سے منع کر دیا تھا طبیعت کی ناسازی کے باعث۔وہ بجھے دل کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا کہ لان کے پچھلے حصے میں تیمیہ اسے غائب ہوتی دکھی تھی۔وہ جانے کس زعم میں گیٹ کی طرف جانے کے بجائے وہاں چلا آیا تھا۔وہ سمیع سے بے نیاز مٹی کے سرخ پیالوں میں باجرہ اور پانی بھر رہی تھی یکدم اس کا دوپٹہ سر سے سرک گیا تھا، اس کی نظر پلو سر پر کھینچتے ہوئے سامنے ساکت کھڑے سمیع پر پڑی۔جو خفت اس کے چہرے پر ابھری تھی سمیع کا دل چاہا کوئی غیر مرئی قوت اسے اس پل سے، اس زمین سے غائب کر دے وہ قدم آگے نہیں بڑھا سکا اور وہ پلو سر پر دوبارہ کھینچ چکی تھی۔آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پاس آئی سانس لینے

میں تکلیف ہو رہی تھی اسے، آج اس کی مسکراہٹ سیاہ تھی سمیع کو بابا کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ یاد آئی ان کی مسکراہٹ کا رنگ بھی یہی ہوتا تھا آخری وقت میں، اسے جھرجھری سی آئی۔

"کینسر ہے مجھے یہاں اسی لیے۔۔۔علاج کے لیے۔۔۔" وہ یک ٹک دیکھے گیا پلکیں نہیں جھپک سکا۔

"کیموتھراپی ہو رہی ہے۔۔۔ہر تین مہینے بعد۔۔۔ کبھی کبھی ہر چیز سے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔" اس کے چہرے پر کھنڈی زردی کی وجہ سمجھ آئی تھی۔ وہ بغیر ایک لفظ کہے بھاری قدموں سے باہر نکل آیا تھا۔

رات پھیلی ہے تیرے سرمئی آنچل کی طرح
چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

اس نے گانا پلے کر کے سر کرسی کی پشت پر رکھ دیا، پروگرام اسی گانے کے ساتھ اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خشک پتوں کی طرح لوگ اڑے جاتے ہیں
شہر بھی اب تو نظر آتا ہے جنگل کی طرح

پھر خیالوں میں ترے قرب کی خوشبو جاگی

تیمیہ نے لرزتے ہاتھوں سے ریڈیو آف کیا تھا اور بستر میں گھس گئی۔ آج امی کا فون بھی آتا رہا تھا مگر وہ بات نہیں کر پا رہی تھی اسے لگ رہا تھا بات کرے گی تو رو دے گی۔

پھر برسنے لگی آنکھ مری بادل کی طرح

وہ چار کلو میٹر دور سے پیدل چلتا ہوا گھر پہنچا تھا، بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تمہارے نام کے یک رنگی دھاگے سے
میں ست رنگی نظم بنوں گی
اس سے بنا کے پھندنے والی ٹوپی
سردیوں میں پہن لوں گی
کبھی اسے ریشہ ریشہ بکھیر کر
اپنی انگلیوں کی پوروں سے چنوں گی

اس کا حرف حرف لکھوں گی
اس کا حرف حرف پڑھوں گی
اس پہ مشتمل صحیفے کو
نیلے مخمل میں قید کر لوں گی
اس پہ عطر چھڑکا کروں گی
اس پر روز ایک ہر اپتار کھوں گی

"کل بہت اداس کر دینے والا پروگرام تھا۔۔۔میں تو سنتی ہی چٹکلوں کے لیے تھی آپ کا پروگرام۔"اس نے اس کی ہدایت پر لکھا گیا ایک افسانہ سامنے رکھتے ہوئے کہا جبکہ فوزیہ چائے سرو کر رہی تھی۔

"کل اماں کی برسی تھی۔"اس نے نارمل لہجے میں کہتے فوراً ہی چائے کا کپ اٹھا لیا تھا نظریں وین گاف کی سٹاری نائٹ کی طرف گئی تھیں۔

"اوہ! سوری کب ہوا ان کا انتقال۔۔۔؟"

"چار سال پہلے۔"

"آپ نے افسانہ میگزین میں پوسٹ کیا تھا اس کا جواب آیا؟"

ابھی تک تو نہیں اور مجھے یقین ہے آئے گا بھی نہیں۔"

کیوں نہیں آئے گا وہ صرف ایک کہانی نہیں۔۔۔ایک فلسفہ ہے۔۔۔حکمت اور

محبت۔"وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"میگزینز اپنے قارین کے مطابق تحریریں چھاپتے ہیں، ہر ایک کے فلسفے کو اہمیت دینے کا وقت نہیں ہوتا ان کے پاس۔ کئی کئی سال آپ کی تحریر رکی رہ سکتی ہے اور ردی میں جا سکتی

ہے۔"

"آپ کو پتہ رچرڈ بیچ نے کیا کہا ہے؟"

"کیا کہا ہے۔۔۔"تیمیہ نے اس کا موڈ ٹھیک ہوتے دیکھ کر دل میں شکر ادا کیا۔

"یہی کہ جب کیٹر پلر (سنڈی) سوچنے لگتا ہے کہ اس کی دنیا ختم ہو گئی وہ تتلی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔۔۔آپ کی تحریریں بھی جب لوگوں کے سامنے آ گئی ایک بار تو وہ تتلیاں بن کر باغ باغ منڈلائیں گی۔"وہ اسے امید کا ہر جگنو، روشنی کی ہر کرن تھمانا

چاہتا تھا۔ تیمیہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی،وہ بھی مسکرادیا مگر اس کی مسکراہٹ زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکی تھی سمٹ گئی تھی۔ایسا کیوں ہوتا ہے دل سے قریب لوگ اس کے مقدر میں نہیں۔

"آپ اپنا لکھنے کا انداز تبدیل نہیں کریں گی۔"وہ اس کی دل جوئی کر رہا تھا اور اندر اندر اس سے ناراض بھی تھا بلاوجہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"تم سب آ کے مل لیا کرو نا میں بے حد اداس ہو جاتا ہوں اس کے لیے۔"وہ فوزیہ کے ساتھ تیار ہو کر لاؤنج میں آئی تو تایا ابا اباسے کہہ رہے تھے۔بے اختیار مان بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھلی تھی۔"تایا ابا میرے بیسٹ فرینڈ ہیں" اس نے فخر سے سوچا۔

"اس کی ماں بھی تو اداس ہو جاتی ہے۔"اس کے جھکے سر پر ہلکا سا ہاتھ پھیرتے ابا گویا ہوئے تھے۔چہرے پر کچھ دیر پہلے کی گئی گفتگو کے سائے تھے۔

"کیموتھراپی کے باوجود طبیعت میں سدھار بہت آہستہ ہو رہا ہے۔"بڑے بھائی نے تشویش سے بتایا تھا۔"میں بات کر رہا ہوں اگر ڈاکٹروں نے کہا تو باہر بھجوا کر علاج کروائیں گے۔"میز پر جانے کیا کیا لوازمات سجے تھے۔بڑا بھائی فرصت سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ان کے پاس رکنے کا وقت نہیں تھا حالانکہ اب پہلے جیسے شکوے بھی نہیں رہے تھے۔بڑے بھائی کی خاندان سے بغاوت ،شہر میں رہنا،بیوی کا جاب کرنا ابا کی مرضی کے خلاف۔۔۔اب تو وہ خود اتنا بدل گئے تھے،وقت کے ساتھ بدلنا پڑتا ہے انہوں نے جانا تھا جو وقت سے پہلے تبدیل ہوتے ہیں انہیں دنیا باغی کہتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆۔

بابا آگے والی سیٹ پر کسی سے آدھے گھنٹے سے محو گفتگو تھے،فوزیہ خاموش بیٹھی تھی شاید اونگھ رہی تھی۔اس نے پیچھے کی طرف دوڑتے منظر کو اداسی سے دیکھا تایا ابو،ریحان کی لائبریری اور سمیع کی کلاس وہ سب چیزیں ان پندرہ دنوں میں بری طرح مس کرے گی مگر اماں سے ملنا بھی تو ضروری ہے اس نے خود کو جھڑکا تھا۔

یار اڑیا رب کرکے مینوں پین ورہا دے کیڑے وے
نیناں دے دو صندلیں بوہے جان سدا لئی بھیڑے وے

ابا نے گفتگو ختم کر کے ریڈیو آن کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"اماں آپ نے میرے کمرے میں اتنے سرخ رنگ کے پردے کیوں لگوا دیے ہیں۔"اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرا کر کہا تھا۔

"میری پچھلے ہفتے رانی سے ملاقات ہوئی تھی وہ کہہ رہی تھی کہ کینسر میں سرخ رنگ کی چیزیں آس پاس ہوں تو۔۔۔"اماں کہہ کر منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگی تھیں وہ بے اختیار ان کے گلے سے لگ گئی۔

"رانی چاچی کہہ رہی تھیں تو صحیح ہی کہہ رہی ہوں گی۔"اس نے ان کو دلاسہ دیا تھا۔

"ہاں وہ کہہ رہی تھی اس رنگ کے اثر سے کینسر کے جراثیم کمزور ہو جاتے ہیں۔"وہ اسے اپنی گود میں سمیٹتے بولی تھیں۔وہ خاموشی سے ان کی ممتا بھری خوشبو اپنے اندر اتارنے لگی۔بچپن میں وہ وہ کمروں کی دیواریں پینسل سے نقش و نگار بنا بنا کر بھر دیا کرتی تھی اماں نے اسے آج تک ایک لفظ نہیں کہا تھا وہ آج کیسے ان کا دل توڑ سکتی تھی۔"

"اس کلموہی کو تو اجازت دے دی ہے انہوں نے پڑھنے کی۔"بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اب اماں کو شکوے یاد آئے جو وہ صرف اس سے ہی کر سکتی تھیں۔

"کس کو؟"تیمیہ گود میں منہ چھپائے بولی تھی۔

"ربیعہ کو۔"اماں نے سوکن کی بہو کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا کیسے مانے ابا؟"تیمیہ اٹھ بیٹھی تھی۔

"بس بیٹے نے دھمکی دی تھی گھر چھوڑ دے گا۔۔۔"

"ہنہ۔۔۔کیا ابا کا دل اتنا نرم پڑ گیا ہے۔۔۔"

"پتا نہیں ساری نرمیوں کے سلسلے اسی سے وابستہ ہیں۔"

"میں بھی داخلہ لے کر امتحان دے دوں اماں۔"وہ بے اختیار بولی تھی۔

"اب امتحان دینے کی عمر ہے تیری،یہ موا کینسر نہ ہوتا تو اپنے گھر کی ہوتی۔"ایک دم ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"تیرے ابا نے بھی مرنا جینا ختم کر دیا ہے ان سے کہہ آئے ہیں اب شادی مرگ کسی پر سامنا نہ ہو گا۔"

"اماں انہوں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔"وہ مدھم سا بولی تھی۔

"لے بچپن کی منگنی توڑ ڈالی اور کہہ رہی ہے کچھ غلط نہیں کیا۔"وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یاداں دا ایک چھنب ٹیلا

سدا لئی سک جاوے وے

کھڑیاں روپ میرے دیاں کمیاں

آ کوئی ڈھور لتیڑے وے

صحن میں نسیمہ گندم چھانتے گنگنا رہی تھی وہ ہمیشہ کی طرح بت بنی اس کا گانا سن رہی تھی اس کی آواز میں اتنا درد کیوں تھا کیا وہ بھی پڑھنا چاہتی تھی۔۔۔اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنا چاہتی تھی یا یہ غربت تھی۔۔۔اس کے بچوں کی ناتمام خواہشیں۔

بنھ تیری چوون دیدے

جد تیرا چیتا آوے وے

ایسا سرد بھراں اک ہوکا

ٹٹ جاون میرے بیڑے وے

سمے کا اداس پنچھی اپنے زرد پر پھیلائے آسمان کے کنارے پر بیٹھا تھا۔اس نے نگاہ کی تو اس کے پر دھیرے سے پھڑ پھڑائے تیمیہ کے چہرے پر گھائل سی مسکراہٹ ابھری اور وقت کے چہرے پر بھی۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا اس نے وقت کو مجسم روپ میں دیکھا تھا وہ شروع سے ایسے ہی دیکھتی آئی تھی ہاں اس نے اس سے گفتگو کی کوشش نہیں کی تھی کبھی۔جب اماں، ابا کے توجہ نہ دینے پر بین کرنے لگتیں تو ابا پھنکار کر کہتے تھے ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ اماں کے گھٹنوں پر آ لگیں، بچپن میں اس کا دل چاہتا تھا وہ بھی ابا اور بھائیوں کے ساتھ شکار پر جائے خوب مزے کرے جیسے وہ قصے سناتے تھے مگر ابا کہتے بیٹیوں کو ایسی جگہوں پر کون لیکر باہر نکلتا ہے تب وقت کا پنچھی اسے سرسراتا روتا محسوس ہوتا۔بیٹے کی خواہش نے انہیں دوسری شادی پر مجبور کیا تھا مگر پھر زمینوں کے بعد کا وقت سارا کا سارا اس کی سوتیلی ماں اور بھائیوں کا ہو گیا۔

"جو مجھے بیٹا ہو جاتا تو آج یہ وقت نہ دیکھ رہی ہوتی۔"اماں بلکتیں وہ سمے کے پنچھی کی طرف آزردہ نظروں سے دیکھتی اس کے پروں پر خراشیں تھیں ان میں سے خون رستا تھا۔

"میں اتنے کم وقت میں تیاری نہیں کر سکتا امتحان کی۔"بھائی نے ایک دن کتابیں پھینک دی تھیں اور وہ سینے سے لگائے کمرے میں لے آئی تھی۔ تین سوتیلے بھائیوں میں سے ایک بس خالد ہی تھا جسے اس سے کچھ لگاؤ تھا وہ اس کو ابا سے چوری کتابیں خرید کر لا کر دیا کرتا تھا۔ سمیع کہتا تھا اس کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ صرف لکھے اسے معاش کی فکر ہے حالانکہ وہ اگر لکھتا تو جو تخلیق ہوتا وہ ایک خدمت تھی۔وہ اتنی اچھی باتیں کرتا تھا مگر وہ کہتا تھا وہ لوگوں کے رد عمل سے ڈرتا ہے۔لوگ قدردان کم ہی ہوتے ہیں لیکن وقت تو ہوتا ہے چاہے وہ ہڈیوں کے مٹی ہو جانے کے بعد قدردانی کا وہ تحفہ عنایت کرے۔اس نے وقت کے زرد

پروں سے سرخ قطرے گرتے دیکھے ڈاکٹر کہتے تھے اگر اس کے وقت پر کیمو تھراپی کے سیشنز نہ ہوئے تو۔۔۔تو اس کا وقت ختم ہوتا جارہا ہے۔۔۔ اس کے ہاتھ میں آئن سٹائن کی بائیو گرافی تھی اس نے ایک نظر نیچے صحن میں دیکھا وزیر تعلیم اس کے ان پڑھ ابا کے گھٹنے چھو رہا تھا، اماں سرخ آنکھوں سے سوکن کو بیٹے کے لائے کپڑوں میں ملبوس دیکھ رہی تھیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود رشتوں کو نبھانے میں ناکام ہے اس نے اخذ کیا تھا ابا، اماں سوتیلی ماں سبھی۔

زرد پنچھی کی نگاہ اس نازک لڑکی سے ہوتی میلوں دور بیٹھے بظاہر آسمان کو تکتے اس لڑکے کی طرف گئی تھی جس کے دل کا وقت تب سے ٹھہرا ہوا تھا جب سے اس نے اس لڑکی کی طرف پہلی نگاہ اٹھائی تھی۔

"اب اماں کو بیٹا نہ ہونے کا قلق نہیں ہوتا۔"

"تو اب کس بات کا ہوتا ہے؟" اس نے چائے کی بھاپ پر نظر جمائے کہا۔

"اس بات کا کہ ان کی اولاد اپنی کمائی ان کے ہاتھ میں نہیں رکھ سکتی۔۔۔ ان کے لیے خود سے ایک شال تک نہیں خرید سکتی۔۔۔اور یہ بھی تو اسی لیے ہے نا کہ ان کی اولاد میں کوئی بیٹا نہیں ہے صرف میں ہوں مگر وہ مانتی نہیں ہیں اور جب میں ان کو کہتی ہوں ابا سے کہیں مجھے امتحان دینے دیں کم از کم میٹرک کے تو میرے منہ پر ہاتھ رکھ اتنی زور سے شش کہتی ہیں کہ صحن میں چھپی ہوئی ساری بلیلاں بھاگ جاتی ہیں۔" وہ ہنسی تھی یا شاید روئی تھی۔

"جب میں چھوٹی تھی تو میرے پاس انگلش کی ایک کتاب تھی، ایڈونچر انگلش۔ اس میں ایک نظم تھی جس میں بیٹے کی خواہش کے برعکس ایک آدمی کے گھر بیٹی پیدا ہو جاتی ہے۔ خبر سنتے ہی باپ کے بال گھنگھریالے ہو جاتے ہیں اور چہرہ سرخ۔ میں نے جب ماسٹر سلطان سے وہ نظم پڑھی تو دوڑ کر ابا کے پاس گئی اور جب ان سے یہ پوچھا کیا ان کے سر کے بال میرے پیدا ہونے کے بعد گھنگھریالے ہوئے تو پہلے تو وہ خاموش ہو گئے پھر ہنس پڑے اور دیر تک ہنستے رہے۔۔۔ لیکن مجھے اب تک یقین ہے ان کے بال میری وجہ سے ہی گھنگریالے ہوئے تھے۔

اگر مجھے ایک نئی زندگی ملے تو میں اللہ سے کہوں گی وہ مجھے تایا ابو کے گھر پیدا کرے پھر میں خوب پڑھوں گی۔" سمیع نے اسے یاد کرتے ہوئے آسمان کی طرف نگاہ کی جہاں اسے سمے کا زرد پنچھی نظر نہیں آیا تھا جس کی ایک آنکھ اس پر اور ایک میلوں دور چھت پر بیٹھی تیمیہ پر تھی جس کے پروں کے زخم ہلکا ہلکا رستے تھے۔

اس نے اس کی تحریریں پڑھی تھیں وہ کمال کا لکھتی تھی۔

"میں خلیل جبران کی دی پرافٹ (پیغمبر) کی طرح ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔"

"اس نے اسے کہا تھا اور اس میں کیا مضامین ہوں گے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"روح، رنگ، خوشبو، آواز، سائے، خواب، وقت۔۔۔"

"وقت کیا ہے تمہارے نزدیک؟" اس نے دلچسپی سے اسے پوچھا تھا۔

"وقت ایک وجود ہے، اس کا چہرہ خوبصورت ہے مگر آزردہ ہے، اس کی نگاہ بلند ہے مگر آنسو آنسو ہے۔ آپ کو پتہ ہے اب تک بزنس کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہو پائے اس لیے نہیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ میں ہمت نہیں۔۔۔پیسے نہیں بلکہ اس لیے کیونکہ آپ نے وقت نہیں نکالا۔ خالق کو بھی وقت سے بہت پیار ہے اور جن جن چیزوں کو اس نے وقت دیکر بنایا ہے ان سے بھی۔"

"وہ کیسے؟"

"دیکھیے انسان کیسے بنا۔۔۔ایک عرصہ گارے سے بنے ااس کے وجود پر اس کے خالق کی محبت بھری نگاہوں کی شعائیں پڑتی رہیں۔ وہ بنا زندگی کے، بے روح، خود سے انجان وہاں پڑا تھا، اس کے وجود کا خمیر ابھی تکمیل کے مراحل میں تھا۔" وہ جواب میں اسے قصہ سنانے بیٹھ گئی تھی۔

"تراب (مٹی)، طین (گارا)، حما مسنون (چپکتی مٹی)، صلصال (کھڑکتی مٹی) اور پھر وہ وجود میں آیا لمحہ کن سے نہیں، خالق کے لمس سے، وقت کی کرامت نے اس پر اپنا نقش چھوڑا۔ جس میں آگ کے شرارے سا دشمن جاں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکلتا اس کو کھٹکھٹا، کھٹکھٹا کر دیکھتا اور کہتا تم کس لیے بنائے گئے ہو؟" وہ جیسے سٹیج پر ڈرامہ دیکھ رہا تھا اس کے ڈائیلاگز کے زیر و بم میں کھویا اور وہ سرخ اور سنہری کناری والی سفید ساڑھی میں ملبوس تنہا سٹیج پر کھڑی اسے گیان دے رہی تھی۔ اس کے ارد گرد ستار بج رہے تھے، لمبے بال گھٹنوں کو چھو رہے تھے وہ میرا تھی یا العجلیہ کا ادھورا عکس (دسویں صدی کی مسلمان خاتون ماہر فلکیات) یا میلیوا مارک (آئن سٹائن کی بیوی جو کہ بذات خود ایک ذہین سائینسدان تھی) یا کوئی راہبہ۔

"وہ اترا کر کہتا اگر مجھے اس تخلیق پر طاقت ملی میں اسے بہکالوں گا یہ کھوکھلا ہے۔۔۔" وہ محو سی بول رہی تھی۔۔۔وہ محو سا سن رہا تھا۔

"پھر روح پھونک دی گئی تھی، روح کے ننھے ننھے ستاروں نے دماغ کو روشن کیا اور چہرے میں داخل ہوئے۔۔۔ آچھو، گارے سے بنا وجود جس پر اس کے خالق کے ہاتھ کا لمس ابھی دہک رہا تھا چھینکا اور بے اختیار اس کے لبوں سے پھسلا الحمدللہ (سب تعریف اور شکر اللہ کے لیے ہے) خالق نے محبت سے جواب دیا یارحمک اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) انسان اور اس کے رب کی پہلی گفتگو جس کی بازگشت دل کی دھڑکنوں میں سنائی دیتی ہے کہ جب جب تو شکر کرے گا وہ تجھ پر رحم کرے گا۔ روح کے ستاروں سے

آنکھیں روشن ہوئیں تو ارد گرد پھیلی دلپزیر، بے نظیر جنت اور اس کے پھلوں کا نظارہ ہوا اور بے اختیار اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر روح کے ستارے تو ابھی جسم کے خلا میں سفر میں تھے ٹانگوں تک نہ پہنچے تھے سو مراد پوری نہ ہوئی۔ رب نے محبت سے کہا انسان جلد باز ہے۔ انسان کو جو چاہیے وہ ابھی چاہیے۔ یہاں دل میں خواہش کی کونپل پھوٹی اور یہاں دل مچلا کہ میرے دامن میں آ گرے۔ انسان بھول جاتا ہے کہ ایسے تو خواہشیں جنت میں پوری ہوں گی۔۔۔ دنیا تو جائے آزمائش ہے۔ یہ زمین و آسماں چھ دن میں بنائے گئے۔۔۔ کیوں؟ وہ کن کہہ کر بھی تو بنا سکتا تھا آدم کے وجود کو ایک عرصے میں اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا صرف ہمیں سمجھانے کے لیے کہ تخلیق تدریج کے ساتھ وجود میں آتی ہے اور وجود تدریج کے ساتھ کاملیت کو پہنچتا ہے۔ ہر چیز کو مکمل ہونے کے لیے معراج تک پہنچنے کے لیے وقت درکار ہے۔ بیج کو ایک عرصہ زمین کے اندر دفن ہو کر گرمی کی شدت، دباؤ برداشت کرنا پڑتا ہے تب اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے، کوئلے کو صدیاں ایک سی دباؤ اور حدت کو سہنا پڑتا ہے تب جا کر وہ ہیرا بنتا ہے۔"

"واہ! اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔" وہ بلش ہوئی تھی۔

"شکریہ۔"

"تو تم نے اسے قلمبند کر لیا؟" کر رہی ہوں۔ اسے اس کا خوش ہونا اچھا لگا تھا اور تیمیہ کی غیر موجودگی میں غیر محسوس طریقے سے اس نے اس کی بات پر عمل کیا تھا اس نے بزنس کے لیے مختلف آپشنز پر غور کرنا شروع کیا تھا، دوست کے ساتھ مل کر پلاننگ کی تھی اور اس کا شدت سے انتظار کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کو گئے ہوئے چھ ہفتوں سے اوپر ہو گئے تھے اور وہ جلے پیر کی بلی طرح اس کی گلی میں روز چکر لگا کے آتا تھا۔ اس نے واپس آ کر کال کرنی تھی مگر اب تک کوئی کال نہیں آئی تھی۔ آج کا دن بھی یونہی بے کلی میں گزرا تھا، رات کا کیڑا اندھیرے کا ریشم بنتا چلا گیا۔ سیاہ ریشم میں لپٹی گلیاں، سڑکیں، بازار۔۔۔ وہ ریستوران میں بیٹھا سرخ کاغذی فانوسوں پر نظر جمائے اپنے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت بھی آزردہ و فکر مند کھانا آرڈر کر کے گلاس سے باہر دیکھتے ہوئے دل میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔

"مجھے کم از کم جا کے ایک بار اور پتہ کرنا چاہیے۔" اس کا یکدم دل چاہا ابھی اٹھ کر چل دے۔

اتنے میں وہ ریستوران میں داخل ہوئی تھی اس کے ساتھ کوئی لڑکا تھا پرکشش شخصیت، امیرانہ اطوار وہ ساکت ہو گیا تھا اسے یقین نہیں آیا پیچھے اسے تایا ابو بھی ساتھ داخل ہوتے نظر آئے۔ وہ تینوں دائیں جانب بیٹھ گئے تھے، وہ اس سے باتیں کر رہا تھا مذاق کر رہا تھا وہ ہنس رہی تھی۔ اسے لگا جیسے دل جسم سے نکال کر کسی نے جلتے تنور میں پھینک دیا ہو۔ تیزی سے اٹھ کر باہر نکلا تھا ویٹر جو کھانا سرو کرنے آیا تھا ہائیں ہائیں کرتا رہ گیا۔ موٹر سائیکل ریستوران کی پارکنگ میں رہ گیا اور وہ پیدل گھر پہنچا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ملیوا مارک نے پرزم ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور اس سے منعکس ہوتی روشنیوں کی سائینسی وجہ اپنے باپ کو بتا کر اس نے حد درجہ اسے متاثر کیا تھا اور اب وہ روشنی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی مگر اندھیرے اس کا مقدر تھے۔ آئن سٹائن کی بائیو گرافی پڑھتے پڑھتے اس نے رک کر چند لمحوں کے لیے سر پلنگ کی پشت پر ٹکا دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی پھر سامنے لگی پینٹنگ پر اداسی سے نگاہ ڈالی جس میں ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ اسے اس پینٹنگ میں سمیع نظر آیا اور وہ خود ستاروں بھرے آسمان کا حصہ تھی۔ وہ اٹھ کر قریب آئی اور دھیرے سے اس کے عکس کو چھوا وہ خود کو جھڑک نہیں سکی تھی، جھجھک نہیں سکی تھی۔ یہ پینٹنگ ریحان اس کے لیے پچھلے سال بطور تحفہ لایا تھا۔ اس کا دل چاہا تصویر میں موجود آسمان تک جاتے شجر سے لپٹ کر اتنا روئے کہ محبت کے ستارے اس کے اندر ٹمٹمانا بند کر دیں۔ جھڑ جائیں اس پر ترس کھائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گھر آ کر اس نے پانی کا پورا جگ اپنے اندر انڈیل لیا تھا۔ چار دن بعد فوزیہ کی کال آئی تھی کہ پڑھائی دوبارہ سے شروع کرنی ہے وہ جو خود سے قسمیں کھائے بیٹھا تھا ایک پل میں ہاں کی تھی اور خود کو تاویلیں دینے لگا تھا۔ "وہ اکیلی تو نہیں تھی وہاں پر ۔۔۔ لیکن اسے واپس آ کر رابطہ تو کرنا چاہیے تھا۔۔۔ شاید ابھی ہی آئی ہو۔۔۔ اور ریحان۔۔۔ یہ وہی تھا جس نے تیمیہ کو موبائل لیکر دیا، فیس بک سے متعارف کروایا۔" آج وہ سوچ رہا تھا وہ کیوں اس پر اتنا مہربان ہے۔

اور اب جب وہ اس کے گھر کی طرف رواں تھا تو خوش تھا، سرور میں تھا جیسے وہ اس سے ناراض ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو وہ لائبریری کی چوکھٹ پر بیٹھی کتاب میں منہمک تھی سر اٹھا کر اسے دیکھا لبوں پر مسکان ابھری۔ وہ پہلے سے کمزور ہو گئی تھی مزید زرد۔

"کتنا عرصہ بیت گیا ہے نا۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔

"کس میں؟" اس نے اس پر پڑی سورج کی کرنوں کا رستہ روک لیا تھا۔

"آخری کلاس ہوئے۔" وہ بولی تھی۔

"اس کے کمزور چہرے نے اس کے اندر کے سارے شکوے گم کر دیے تھے وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔"

"کیا پڑھا جا رہا ہے؟" وہ کھڑی ہو چکی تھی وہیں دروازے سے ٹیک لگا کے پھر سے پڑھنے لگی۔

"بھگود گیتا کا ایک اشلوک ہے۔ کرشن کہتے ہیں اے ارجن خدائے واحد کائنات کے دل میں رہتا ہے وہ امور عالم کو اپنی مشیت کے قلب میں اسی طرح ڈھالتا ہے جس طرح کمہار مٹی سے مختلف شکل کے برتن بناتا ہے۔ اطمینان دل حاصل کرنے کے

لیے تم اس اللہ کی پناہ میں آؤ کہ اس کی نگاہ التفات کے بغیر اصلی سکون نہیں ملتا۔" دھیمی سی مسکان اس کے لبوں پر آکر ٹھہر گئی تھی کیا تھی وہ جلتا سورج، ندی کا چمکتا کنارہ یا آسمان پر دور کہیں کوئی ستارہ جس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ مجھ تک پہنچتی ہے مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو جانے والی تھی سمیع کے لاشعور میں ہلکا ہلکا وقت کا دلاسہ تھا جو بچھڑنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

"تمہیں یہ علم الیقین کیسے دان ہوا ہے تیمیہ۔۔۔ تم کیا ہو۔۔۔ کون ہو۔۔۔ ولیہ ہو؟" اس کا دل چاہا اس کا بکھرا بکھرا وجود سمیٹ لے۔

"ولیہ؟" وہ انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔

"میں تو عام مسلمان کے رتبے پر بھی فائز نہیں۔۔۔ میں اندر سے اتنی کمزور ہو چکی ہوں کہ پانچ وقت کی نمازیں پڑھ نہیں پاتی۔ ہاں مگر میں نے عالم بالا میں کسی سے ایک رابطہ محسوس کیا ہے ہمیشہ۔۔۔ اس عالم میں کوئی ہے کہ جس سے میں نے جب بھی انگلی چھڑوا کر دور جانا چاہا اس نے میری ذات کو گھیر کر اپنی روشنی میں رکھ دیا، میرا دل مٹی کا کچا گھڑا تھا مٹی میں مل جاتا یا شاید سوہنی کے گھڑے کی طرح چناب کے پانیوں میں گھل جاتا مگر اس نے اسے کانچ میں بدل دیا۔۔۔ وہ ٹوٹا تو ستارہ ستارہ ہو گیا دمکتا ہے بھڑکتا ہے وہ اسے روشن رکھتا ہے۔"

اسے دیکھ کر سمیع کو ہمیشہ خلیل جبران کے اس دانشمند نابینا رصاد کا خیال آتا تھا جس نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ میں یہ سب سورج اور چاند اور ستارے یہاں پر دیکھتا ہوں۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر ہمیشہ چاندنی کا گمان ہوتا تھا جو پانی کی روش پر بغیر آہٹ رواں رہتی ہے۔ اس نے کبھی اس سے پوچھا نہیں کہ اتنی حکمت کہاں سے ملی اسے، وہ جانتا تھا اس کا جواب اس نابینا سے مختلف تو نہ ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نم زمین پر زرد پتے گرتے شجر کو اداس کرتے تھے، چڑیا نے گھونسلے سے اڑان بھری بچوں نے سر باہر نکال کر اودھم مچا دیا، گھروں کی باہری دیواریں نم نم سی تھیں رات بارش برستی رہی تھی، سبزی والا ریڑھی پر رکھی سبزیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا سرخ گاجریں، سبز شملہ مرچ، ٹماٹر، پالک، زرد لیموں نکھرے نکھرے، سامنے سے دودھ والا سٹینڈ پر سٹیل کی بوتلوں میں دودھ لیے خراماں خراماں چلتا آرہا تھا۔۔۔ ہر گھر کے دروازے پر رکتا ہوا، صبح کی آمد کا سندیسہ دیتا۔ اخباروں کے تازہ شمارے سیاہی کی خوشبو میں بھیگے نم زمین پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ موڑ مرڑتے ہی سمیع ذرا چوکنا ہو گیا، دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دل نے بے اختیار خواہش کی، خواہش نے لاشعور میں دعا کا روپ دھارا۔۔۔ نظر تیسرے گھر کی بالکونی پر جا الجھی سرخ دیواروں پر سبز بیلیں لپٹی تھیں، گھر کے پاس سے گزرتی تاروں پر کچھ کوّے بیٹھے تھے جن پر اس کی نظریں گڑی تھیں۔ جیسے کسی مصور کا تخیل تھا یہ سب۔ بالکونی

میں کھڑے اس نے سر جھکا کر ہاتھ میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھا پھر نظر سمیع پر پڑی تھی۔وہ یوں کھڑا تھا جیسے پلک جھپکی تو خواب ٹوٹ جائے گا وہ یوں کھڑی تھی کہ خواب ٹوٹے تو وہ جائے۔

اسے اگلے ہفتے انگلینڈ جانا تھا علاج کے لیے اور وہ ساتھ کچھ کتابیں لے کر جانا چاہتی تھی تایا ابو سے اجازت لیکر وہ اور فوزیہ اس کے ساتھ آئی تھیں۔بک شاپ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ستائش اور حیرانی کی سی کیفیت میں ہاتھ ہونٹوں پر رکھے تھے وہ پہلی بار اتنی بڑی بک شاپ دیکھ رہی تھی۔اس نے آزردگی سے اس کی ہلکی بھیگی آنکھیں دیکھیں۔

"کیوں محروم کر دی جاتی ہیں لڑکیاں اپنے حقوق سے،کیوں جانوروں کی طرح رکھا جاتا ہے انہیں۔"وہ سمجھ نہیں پاتا تھا ،اسے یقین نہیں آتا تھا اکیسویں صدی میں تیمیہ جیسے کردار موجود ہیں وہ نابلد تھا تیمیہ کی زندگی میں جو کردار موجود ہیں تیمیہ تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔فوزیہ گاڑی سے باہر نہیں آئی تھی جبکہ وہ اب شیلوز میں سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"تم جانتی ہو تیمیہ کون تھیں؟"اس نے اس کی طرف دیکھا تھا کتاب اٹھاتے ہوئے۔

"ابن تیمیہ کے متعلق تو پڑھا ہو گا؟"

"ہاں پر بہت زیادہ نہیں جتنا مل سکا ادھر ادھر سے۔ان کی کوئی کتاب پڑھنا تو چاہتی تھی میں۔ایک لمبی لسٹ ہے جس تک کبھی پہنچ نہیں پائی۔"

"تیمیہ ان کی دور کی دادی تھیں۔"

"دور کی دادی مطلب ۔۔۔؟"

"مطلب۔۔۔ام۔۔۔پردادی کی بھی پردادی ۔"وہ مسکرایا۔

"اس خاندان میں صرف ایک ابن تیمیہ ہی نہیں بلکہ بے شمار سکالرز پیدا ہوئے اور مزے کی بات یہ ہے کہ سب ابن تیمیہ کے نام سے جانے جاتے رہے لیکن مشہور احمد بن عبدالحلیم ہوئے۔"

اسے یکدم اس سر خوشی نے گھیرا تھا جو کوئی بھی علم کی بات جان کر اس پر نازل ہونے لگتی تھی۔

تیمیہ اپنے زمانے کی سکالر تھیں،نیک پارسا، عالمہ فاضلہ،بہت مطالعہ کرنے والیں۔۔۔ تو بتانے کا مقصد ہے یہ ہے عورت کا اصل رتبہ کہ وہ اس مقام پر پہنچ سکتی ہے کہ نسل در نسل پیدا ہونے والے سکالرز اس کے نام سے جانے جائیں۔"

اماں نے اچھا نام رکھا ہے نا میرا؟اس نے سوال کیا۔

اس کے سوال پر گہری مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔

"اور لسٹ مجھے تھما دو میں پوری کر کے دوں گا۔" اس نے جیسے وعدہ خوشبو کی مانند اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔

"اس سے پہلے مجھے گھر جا کے آپ کو ایک اور چیز دینی ہے۔" وہ کہتی ہوئی اگلی شیلف میں گھس گئی تھی۔

"وہ کیا؟ وہ پیچھے آیا۔

"میں نے زرد کاغذ تقریباً مکمل کر لی ہے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں ایک کتاب لکھ رہی تھی۔" اس نے گلزار کی کتاب اشتیاق سے باہر نکالی تھی۔

"میں تو ایک دن تمہاری کتاب یہاں ہی کسی شیلف میں پڑی دیکھ رہا ہوں۔" وہ مسکرا دی تھی۔ "مجھے آپ کی امیجینیشن اچھی لگی پر میری کوئی خواہش نہیں رہی ایسی کبھی یہ بہت اوپر کی چیز ہے میرے لیے۔"

"پھر لکھا کیوں؟"

"پھول کی قلم جہاں لگا دی جائے وہاں کھلتا ہے۔۔۔ چاہے تمام عمر اس کو دیکھنے سونگھنے کوئی نہ آئے مگر مٹی میں ملی اس کی سیاہ پتیاں اس کے ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ میں بھی ایسے کسی پھول کی قلم تھی۔" اسے غصہ آیا تھا اور کتابوں کا ڈھیر اٹھائے اس کی خوشی دیدنی تھی۔

"میں اکثر سوچتا ہوں اگر تم سکول کالج جاتی تو کیا ہوتی۔۔۔ کہاں ہوتی۔۔۔" وہ فرط جذبات میں مزید کچھ کہہ نہیں سکا۔

"میں جو ہوں مجھے وہی ہونا تھا۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"میں تعلیم حاصل کر بھی لیتی زندگی تو میری۔۔۔"

"خاموش ہو جاؤ۔" اسے یکدم غصہ آیا تھا۔

"یہ کوئی ایسی بڑی بیماری بھی نہیں ہے آج کل تو علاج ہے ہر چیز کا۔ ہر وقت خود ترسی کی کیفیت۔۔۔ زندگی سے مایوسی۔ ہم مایوس ہوتے ہیں تو زندگی ہمیں مایوس کرتی ہے ہم امید کو اپنے اندر مرنے نہ دیں تو زندگی امید ہے۔۔۔ خوشی ہے۔" وہ اس طرح ڈپٹ کر بولنے پر یکدم خاموش ہو گئی اسے شرمندگی ہوئی۔

"آئی ایم ساری!"

"کس لیے؟" وہ انجان بنی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"میں سخت لہجے میں۔۔۔"

"ہمارے خاندان کی عورتوں کو اتنی جھڑکیوں کی عادت ہوتی ہے۔" اس کا ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا، وہ مزید شرمندہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس نے اسے بنڈل پکڑایا تھا۔

"میں نے جو بھی لکھا ہے یہی ہے۔" وہ اسے جانے سے پہلے یہ کیوں تھمارہی تھی شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے پڑھے وہ بے چین ہوا تھا۔

"میں نے اسے لکھا کیونکہ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے یہ لکھنا ہو گا۔" سمیع کو وہ ہزاروں سال قبل لکھی کوئی کتاب لگتی تھی جو کہانیوں سے پر تھی اس کے پاس ہر عمل ہر چیز کے سیاق وسباق میں کہانی موجود تھی۔

"جب میں تیرہ چودہ برس کی تھی تو ایک بار دیوار کے ساتھ لگ کر رو رہی تھی اماں نے ڈانٹا تھا اور بھائی جو نئے یونیفام میں سکول جارے تھے میرا دل مزید دکھی ہو رہا تھا۔ اتنے میں بابا مہر دین ان کو وہاں سبھی اسی نام سے بلاتے تھے آ گئے ۔اکثر اماں ان کو کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ چوکھٹ پر بیٹھے کچھ دیر مجھے دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے مجھ سے رونے کا سبب پوچھا تو میں نے انہیں اپنی وہ بات بتا دی جس کا رازدان صرف خدا تھا۔۔۔ میں گھر سے بھاگ جانا چاہتی ہوں پر مجھے ڈر لگتا ہے یا مر جانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں لڑکی ہوں میں اپنی ماں کے لیے پریشانی کا باعث ہوں، باپ کے لیے دل کا روگ ہوں اور خود کے لیے بوجھ ہوں۔" وہ اٹھے اور میرے سامنے آ بیٹھے زمین پر اور مجھے ایک کہانی سنانے لگے ،ان کی آنکھیں۔۔۔ ایسے چمکتی تھیں جیسے ستارے۔

"آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل ایک درویش تھا جو سیاہ لباس زیب تن کرتا تھا، جس نے اپنے گھنگھریالے بال اپنے محبوب سے ملنے سے پہلے مونڈھ ڈالے تھے، چمکیلی آنکھیں بالکل تمہاری طرح، جو عقاب کی سی شان والا کلاہ سر پر رکھتا تھا جس پر کلمہ توحید لکھا تھا، ہاتھ میں لمبی نوک دار سنہری چھڑی رکھتا تھا۔ میرے تخیل میں اس درویش کا روپ ظاہر ہوا۔ اور وہ بولتے چلے گئے وہ کونیا میں اپنے ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں آیا تھا جس سے اس کی ذہنی ہم آہنگی ہو۔

میں اپنا رونا دھونا بھول کر اس کی کہانی میں کھو گئی۔

اس کا نام شمس دین تھا اور دنیا اسے شمس تبریز کے نام سے پہچانتی ہے۔۔۔ جو کھاڈی پر کپڑے بنا کرتا تھا۔ پھر اس نے اپنی جڑواں روح کو پہچان لیا۔"

"کون تھی اس کی جڑواں روح۔" تیرہ سال کی بچی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مولانا جلال الدین بلخی جسے دنیا رومی کے نام سے جانتی ہے۔ تم میں میں وہ علم و محبت کا شمس طلوع ہوتا دیکھتا ہوں۔۔۔ اس

رومی کا عکس دیکھتا ہوں۔ علم چل کر خود تمہارے پاس آئے گا اور یاد رکھنا علم ڈگریوں کا محتاج نہیں۔۔۔ اور شہرت کا نہیں۔ یہ کتابیں۔۔۔"اس نے ایک رو میں رکھی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کی زندگی ساری کہانی ہے، ان پر تنقید و تعریف، ان کی زندگی کے بارے میں متضاد خیالات، ان سے جڑے لوگوں کی کہانیاں اور۔۔۔ محبت کے چالیس اصول۔۔۔ اور۔۔۔ کو نیا۔"

"جب تم واپس آؤ گی پھر ہم ڈسکس کریں گے تمہاری کتاب اور یہ سب کتابیں بھی۔۔۔ رومی اور شمس کی کہانی بھی۔"

"اگر میں واپس آئی تو کلاس دوبارہ شروع نہیں کر سکیں گے اماں ابا اب مجھے یہاں مزید نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ میری شادی کر دیں گے اور دوسری صورت۔۔۔ خیر دونوں صورتوں میں اب مجھے جانا ہے۔"وہ سنگدلی سے بولی۔

وہ گنگ زبان لیے کھڑا رہا وہ چلی گئی۔ اس کے پاس ہر شے کی کہانی تھی، ہر کتاب کی کہ یہ اس نے کس سال کس طرح حاصل کی، ہر ڈیکوریشن پیس کی، ہر گیت کی ہر سر کی کہ کیسے اس سے متعارف ہوئی۔ اس نے سمیع کی زندگی کو بھی کہانی کی طرح بنا دیا تھا۔ یہ کہانی وہ کس کو سنائے گی کہ وہ اس سے کیسے ملی؟ کیوں ملی؟ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

ازل و ابد کے کناروں کناروں نے کی آواز پھیل رہی تھی، درویش غم میں رقص کناں تھے۔ یہ راگ سمیع کو اس نے سنوایا تھا اور اس نے تب سنا تھا جب اس کے بابا ان سب کو لے کر ترکی گئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆۔

وہ لندن کے ایک مشہور اور بڑے ہسپتال میں کھڑکی پر کسی مجسمے کی طرح ایستادہ تھی۔ ایسا لگتا ہے میری زندگی کا آخری پتا گرنے کو ہے اس نے باہر گرتی برف کو دیکھا تھا اسے بے اختیار لاسٹ لیف کہانی یاد آئی۔ اور یہاں کوئی نہیں ہے جو میرے لیے وہ آخری پتا پینٹ کر دے پھر سمیع کا خیال اسے بے وجہ آیا تھا وہ ہوتا تو شاید وہ یہ کام کر دیتا۔ موبائل سکرین روشن ہوئی تھی۔

"لفظ مجھ پر شبنم بن کے گرتے ہیں اور رس بن جاتے ہیں
پڑھنے والا شہد کی سنہری مکھی ہے جو اس رس کو پیتا ہے
اور اپنے اپنے ذائقے کی شہد بنا لیتا ہے جیسے۔۔۔"

"شروع کر دی آپ نے؟" اس نے ٹائپ کیا۔

"ہاں!" سمیع مسکرایا ابھی ہی۔

اس نے اپنے دوست کے ساتھ بزنس پلین پر کام شروع کر دیا تھا، دن رات کی محنت سے وہ ایپ بنا رہا تھا جس کا کام بھی

تقریباً مکمل تھا۔اس سے لوگ گھر بیٹھے ان کی کمپنی سے کنٹیکٹ کر سکتے تھے، فرنیچر شو روم کے لیے جگہ دیکھ لی تھی، لون اپروو کروانے کے لیے وہ آج کل ڈاکومینٹس پورے کر رہا تھا۔دن رات وہ یا تو ان کاموں میں مصروف ہوتا تھا یا زرد کاغذ میں۔دن رات سانس کے ساتھ جو جاری تھی وہ دعا تھی تیمیہ کی واپسی کی۔

کیا تم ان اعداد کو شمار کر سکتے ہو

جن میں یہ سارے

سیارے اور ستارے ہیں

جو ھو کے عالم میں تیرتے ہیں

لاسے پیدا ہو کر کرلا میں غرق ہو جاتے ہیں

ان اعداد کو جن میں

میں اور تم ہیں

یہ رنگ بدلتی بوندوں سے بنے سمندر ہیں

کیا تم ان ریت کے ذرات کا حساب رکھ سکتے ہو

جو صحراوں کی صورت پھیلے ہیں

یہ ہندسے

جنہیں بیڑیوں میں ڈال کر قید کرنا چاہو تو نہ کر سکو

اور یہ زاویئے

محسور کن و دلفریب زاویئے

جن میں ذرا سی لغزش موت ہے

جن کا پابند ہے یہ عالم بھی

میں اور تم بھی

اربوں سال سے کائنات میں بہتی یہ زندگی کی لہر

اور یہ کشش ثقل

دل کی دھڑکن کی بحر

جو دکھائی نہیں دیتی، سجھائی نہیں دیتی

کبھی غور کیا ہے کیا ہیں یہ لفظ۔۔۔

جنہیں محسوس کیے بغیر میں اور تم بولتے ہیں

جو دائمی ہیں

تحفہ رب

جن سے قرن ہا قرن دنیا میں زبانوں کے کھیس بنے گئے

رنگ رنگ کے کھیس

کچھ نرم و گداز کچھ کھردرے

یہ سناٹے اور آوازیں

گھٹاٹوپ اندھیرے

روشنیوں کے ڈیرے

گھٹتے بڑھتے سائے

عکس و خوشبو پیرائے

اور وہ ایک چیز جو اگر نہ ہو تو سب کچھ بیکار ہے

نیست ہے، بے ہست ہے

وہ شعور کا ایک موتی

جو گرمی عشق سے

ذرہ ذرہ ذہن کے سیپ میں داخل ہونے والے علم سے وجود میں آتا ہے

وہ شعور کا ایک موتی جو ہے تو نظارہ عالم و دل ہے

نہیں ہے تو ہر شے نیست ہے بے ہست ہے

"یہ ماسٹر پیس ہے۔" وہ کیمو تھراپی کرواکے کمرے کمرے میں لائی گئی تھی اتنے درد سے گزرنے کے بعد اس میں سانس لینے کی بھی طاقت نہیں تھی، اگلے دن اس کا میسج چیک کیا تھا۔ سر پر جو رہے سہے بال تھے وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ اس نے لکھا تھا۔

"آخری پتہ گر چکا ہے۔" مگر بھیجا نہیں سیو کر لیا تھا۔

"اسے کینسر کسی جنیاتی خرابی (Genetic Disorder) کی وجہ سے نہیں خواہشوں کا گلا گھوٹنے کی وجہ سے ہوا ہے۔" سمیع سوچتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اور تایا ابا لندن میں تھے،اماں پچھلے ہفتے پاکستان لوٹ گئی تھیں اس کے لیے گھر میں کچھ انتظامات کرنا تھے۔مزید کیمو تھراپی کی اب ضرورت نہیں رہی تھی ڈاکٹرز نے کہا تھا اسے گھر رکھیں اور خوش رکھیں۔پاکستان آتے ہوئے راستے میں اس کی طبیعت خراب ہونے کے باعث جہاز کی ایمر جنسی لینڈنگ کونیامیں کرنی پڑی۔وہ ہوش میں آئی تو تکلیف بھول گئی

"میں کونیامیں ہوں؟" تایاابانے نم آنکھوں سے سر ہلایا۔

کونیاشہر قلوب۔۔۔شہر عشق۔۔۔گلابوں کاشہر جہاں خزاں کاموسم ٹھہرا تھا،سرخ گلاب زرد قباؤڑھے سوگ کرتے تھے،ہجر کانوحہ پڑھتے تھے۔

"تایاابا میں یہاں کچھ دن۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تایاابانے اسی وقت ہاٹل بکنگ کے لیے فون کیا تھا۔

تایاابا اسے ہاٹل لے آئے تھے،چنار ہاٹل کی مختصر عمارت مولانا روم کے مزار کے بالکل سامنے تھی۔ان تین دنوں میں اس نے ایک عمر جی تھی۔تایاابانے گھر فون کر کے بتایا اماں تڑپنے لگیں۔"ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں اسے یہ وقت میرے ساتھ گزارنے دیجیے بھائی صاحب۔"

"میں آپ کے دل کی حالت سمجھتاہوں پر میں اس کی خواہش رد نہیں کرنا چاہتادو دن کی بات ہے اسے اپنی خواہش پوری کر لینے دیجیے بھابی۔"

اور ابا وہ بس آج کل حقہ گڑ گڑاتے رہتے تھے پوتے پوتیوں کو یونیفارم میں قہقہے لگاتے سکول جاتے دیکھتے تو گھر کے کونے کھدروں سے تیمیہ کی دبی دبی سسکیاں بر آمد ہونے لگتیں،اس کے بھیگے گال جب پہلی بار وہ منتیں کرنے آئی تھی کہ اس کو میٹرک کے امتحان دینے کی اجازت دی جائے۔کش لمبے ہونے لگتے،کمرہ دھواں دھواں ہو جاتا مگر غم ہلکانہ ہوتا۔اس کے ہاتھ کی بنی چائے پیے عرصہ ہو گیا تھا۔۔۔اس کے چہرے پر مسکان دیکھے زمانے بیت گئے تھے۔

انکھیاں سجن دی دید دی پیاسی

سجن سمندر پار

اس نے ڈرپ کے نوزل سے سجے زخمی زخمی ہاتھ سے پردہ بمشکل ہٹا کر سامنے دیکھا۔اس کے ہاٹل کے کمرے کی کھڑکی سے مزار اور مسجد نظر آتے تھا۔۔۔ مجسم محبت مسجد سلطان سلیم کے سرمئی گنبد،سبز دائروں میں عثمان،ابو بکر،اللہ، محمد ﷺ،عمر ،علی کے ناموں کی خطاطی اور بالکل ساتھ سامنے مولانا روم کے مزار کی عمارت اور مثل مژگاں سبز مینارا۔مولانا روم کے مزار کی جھلک سے آنکھیں نم ہو گئیں۔

"تو یہ طے تھا مجھے یہاں آنا تھا۔"وائی فائی کا کوڈ ٹائپ کرتے بے اختیار خلش سی ہوئی حیات ۲۰۶۰ یہ حیات اسے پیدا ہونے کے باوجود نصیب کیوں نہیں ہوئی۔۔۔اس کے جسم کا روم روم مردہ ہی رہا۔تو وہ کونیا میں تھی شہر القلوب۔۔۔شہر العشق جہاں سے محبت کے چالیس اصول دینے والا کسی کی تلاش میں سرگرداں پہنچا تھا،زرد گلابوں کا شہر۔

تایا ابا اسے وہیل چیئر پر باہر لے آئے تھے انہوں نے مسجد اور مزار کا جائزہ لینے کی غرض سے باہر سے طواف کیا ۔اس کے لیے یہ طواف آرزو تھا،سبز مینارے پر چودھویں کا چاند دمکتا تھا جیسے اس چاند کو خبر تھی کہ تیمیہ نے آج طواف آرزو کرنا ہے۔سڑک پر زرد روش پر وہ تایا ابا کے ساتھ تھی،درویش سبز رنگ روشنیاں ان مجسموں سے نکلتی تھیں جو سٹریٹ لائٹس کو مزین کرنے کے لیے لگائے گئے تھے۔۔۔درویش مجسمے۔وہاں قریب ایک پرانی لائبریری تھی جس کا دروازہ سختی سے بند تھا اور یہ سختی سے بند جو ہو جاتی ہیں چیزیں یہ دلوں میں زیادہ ہوک پیدا کرتی ہیں۔

"میں تھک گئی ہوں تایا ابو۔"وہ دھیرے سے بڑبڑائی تھی اسے لگا وہ سن نہیں پائیں گے جبکہ وہ اس وقت صرف اسی کو سن رہے تھے،اسی کو سننا چاہتے تھے۔

"چلو کافی پیتے ہیں وہ اسے ہائی کافی لے آئے۔"ڈاکٹر کے وزٹ کا بھی ٹائم ہونے والا تھا۔انہوں نے سیاہ فام ویٹر کو آرڈر لکھوایا۔

"اس شہر میں رنگ باتیں کرتے ہیں۔"اس نے اونگھتے ہوئے سوچا۔سامنے لڑکے لڑکیوں پر مشتمل دوستوں کا گروپ بیٹھا تھا۔۔۔

"کتنے خوبصورت ہیں یہ سب اور کتنے خوش ۔۔۔"ایک اور سوچ آئی۔وہ سب اس سے انجان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔نچلی لمبی شیلف پر سنگ مرمر کے مختلف رنگوں اور ڈیزائن کے پتھر سجاوٹ کی غرض سے رکھے گئے تھے جبکہ اوپر والی شیلف پر کتابوں سے سجاوٹ تھی۔کافی کی خوشبو،لوگوں کے آوارہ قہقہے،رنگ برنگی کتابوں کے عنوان،وہاں کی حدت بھری فضا اور تایا ابا کا مہربان چہرہ اسے جسم کے رعشوں میں اٹھتی درد کی لہروں کو بھلائے دے رہا تھا۔وہ ہر ایک شے،ہر انسان کو یوں محبت سے تکتی تھی جیسے اسے لیے بنائی گئی ہو،ایسے میں ساتھ کوئی شدت سے یاد آتا تھا جیسے سانس آتا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہلکی ہلکی اداس روشنی سفید پردوں سے چھنکتی کمرے میں ٹھہرے کوسے اندھیرے کو پی رہی تھی۔اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے تنہائی اور اداسی کو بیک وقت محسوس کیا ایک دم اماں یاد آئی تھیں رات ان سے بات کرتے کرتے ہی وہ سو گئی تھی۔موبائل اٹھایا تو سمیع کا میسیج تھا وہ حال احوال پوچھ رہا تھا اس کی موجودہ حالت سے بے خبر۔اس نے جواب ٹائپ نہیں کیا تھا۔

تایا ابا اسے ناشتے کے بعد نیچے لے آئے وہ جب تک ہاٹل مینیجر سے مختلف چیزیں ڈسکس کرتے رہے وہ وہاں پر لگی پینٹنگز دیکھتی رہی رات کی تاریکی میں سیاہ پانیوں کو چھپاکے سے اڑاتے سفید گھوڑے اور نیلے پانیوں کے کنارے گھر اور سبزہ۔۔۔

اس قدیم مسجد کی زیارت کے بعد جو اس کے کمرے سے نظر آتی تھی وہ دونوں رومی کے مزار میں داخل ہوئے تھے اسی دروازے سے جس سے رات اس نے اندر جھانکا تھا۔۔۔گلابوں نے ان کا استقبال کیا۔کونیا قدیم دور میں یونانی زبان میں آکونین اور لاطینی میں آئکونیم کے ناموں سے جانا جاتا تھا جو کہ آئیکون سے اخذ شدہ ہے جس کا مفہوم ہے عکس۔کونیا جہاں چیٹل ہوئیک کے کھنڈر دریافت ہوئے،جہاں ۷۵۰۰ قبل مسیح میں لوگ آباد تھے وہ کونیا تیرہویں صدی میں پیدا ہونیوالے مولانا جلال الدین روم کے نام سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔جس کا سنہرا دور بارہویں اور تیرہویں صدی کا ہے جس میں کونیا سلجوق سلطنت روم کا دارلخلافہ تھا۔مولانا روم یہاں رہنے آئے منگولوں سے جان بچا کر ان کے خاندان نے بلخ سے مکہ اور پھر سلطنت روم میں پناہ لی۔

کونیا میں رومی مبلغ اور خطیب کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔۔۔اصول و قواعد والی زندگی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ،شہرت اور دولت کی نعمتوں سے مالا مال کہ ان کی زندگی میں محبت اور عقیدت کا سورج طلوع ہوتا ہے۔شمس تبریز آکر ان پر وہ راز فاش کر دیتا ہے جو ابھی تک نگاہ سے اوجھل تھے جس میں طوائف کو صراط مستقیم دکھایا جا سکتا ہے،کوڑھ کے مریض کو چھوا جا سکتا ہے اور شرابی کی دہائی سنی جا سکتی ہے۔شمس تبریز ان کے اندر کا جوہر ان پر کھول دیتا ہے اور محبت اور بہترین رفیق رومی کے دل میں عشق و علم کی شمع روشن کر کے،اسے انسانیت اور محبت کا عظیم درس دے کر جدا ہو جاتا ہے اور قلم و قلب کے درمیان حائل پردہ ہٹ جاتا ہے۔پھر صفحہ قرطاس سیاہ ہوتے جاتے ہیں،لکڑی سے تراشے قلم روشنیاوں میں بھیگتے چلے جاتے ہیں مثنوی تخلیق ہوتی ہے،دیوان شمس منظر عام پر آتا ہے۔دنیا محبت کے چالیس اصول سیکھتی ہے۔داستان رومی اور شمس۔۔۔اسی رومی کے مزار میں وہ داخل ہوئی تھی جس کے مرشد کے قصے وہ جوگی اسے سنایا کرتا تھا۔سرمئی اداس رنگ کا ایک بڑا گنبد ساتھ دو چھوٹے گنبد اور سبز مینارا۔مزار میں داخلے سے پہلے بائیں جانب مولانا روم کے پوتے کا مزار تھا وہاں فاتحہ پڑھ کر تایا ابو کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی آج وہ خود چل رہی تھی گو کہ ان کے سہارے سے مگر پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔تایا ابو اس کو خود چلتا دیکھ کر کھل اٹھے تھے۔نرس ماریے جو کہ یہیں سے ہائر کی تھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔

اس نے دیکھا بائیں جانب قبروں کی قطار تھی، سبزے سے ڈھکی قبروں کے بس کتبے نظر آ رہے تھے جن کو سورج کی کرنیں منور کرتی تھیں۔ موڑ کے بعد ایک اور سبز قطعہ تھا اس میں بھی قبریں تھیں، اس سبزے میں کہیں کہیں جامنی اور آتشی گلابی پھول کھلے تھے اسی قطعے میں علامہ محمد اقبال کی اعزازی قبر تھی وہ مولانا روم کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ اس کے اندر وہ اعزازی قبر دیکھ کر احساس تفاخر جاگا تھا۔ کہتے ہیں جب مصطفٰی کمال اتاترک اقبال کی قبر کی زیارت کرنے آئے تو ساتھ مولانا روم کی قبر مٹی لے کر آئے تھے اور اسے ان کی قبر پر چھڑکا تھا۔ اور یہ کون سے بندھن ہیں جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔۔۔ ماورائی دنیا پر اب یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے جس میں ہر چیز لہر ہے۔۔۔ خواب ہے۔ جہاں مرشد کا سامنے ہونا ضروری نہیں۔۔۔ محبوب کا سامنے ہونا ضروری نہیں۔ تعلق نہ وقت کا محتاج ہے۔۔۔ نہ آمنے سامنے ہونے کا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"میں تکلیف میں ہوں۔۔۔ میں بہت۔۔۔ تکلیف میں۔۔۔"

دور کسی کے لبوں کی گولائی سے نے کی آواز کو حیات ملتی تھی۔۔۔ وہ کہاں تھی نہ قدم زمین پر تھے نہ سر پر کوئی سائبان تھا۔ بس بہتا خلا ہر چیز گردش میں اور وہ۔۔۔ اس نے دیکھا اس کے ہاتھ اوپر کو اٹھے تھے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی نظر نہیں آتی تھی وہ رقص میں تھا وہ سیاہ پوش رقص میں تھا۔ اس کے اندر اس سے پھوٹتی روشنی جذب ہوتی تھی۔ نے کائنات کے کناروں کناروں کو نچتی تھی۔

"میں تکلیف میں ہوں۔۔۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔۔۔" وہ پھر بڑبڑائی

اب وہ ایک الگ منظر میں تھی۔ اس نے پائنچے موڑ کر اوپر کر رکھے تھے ایک بڑی کشتی جتنا جزیرہ جس کے کنارے میں وہ اور سمیع سنہرے پڑتے پانیوں میں پاؤں ڈالے بیٹھے تھے۔۔۔ دائیں جانب سورج غروب ہو رہا تھا۔ منظر پر دو ہی چیزیں غالب تھیں سورج اور بہتا پانی۔ "میں کہاں ہوں وہ جھٹکے سے اٹھی۔"

یہ مزار میں ہی موجود کمرہ تھا جس میں گونجتی نے کی آواز، سورج کے کھڑکی کے شیشے پر چمکتے عکس اور اوپر لگے زرد اور نیلگوں شیشوں کے رنگوں نے اسے دنیا سے ماورا کر دیا تھا۔ اس نے تایا ابو کو کہا تھا وہ کچھ دیر یہاں ٹھہرنا چاہتی ہے تو وہ قریب بنے کیفے میں گئے تھے۔ انہیں کچھ ضروری کال بھی کرنی تھیں وہاں پاکستان میں سب اس کے لیے فکر مند تھے سو ان کو تسلی دینا بھی ضروری تھا۔ وہ اٹھی تو سامنے تایا ابا کھڑے تھے۔

"ٹھیک ہو بیٹا وہ پریشان ہوئے۔"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا سمیع کا دو تین میسیجز مزید آئے تھے اس نے جواب نہیں دیا۔

تایا ابا کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل آئی دائیں طرف ایک چھوٹے کمرے میں قبر تھی، سادہ پتھر سے بنی۔ کوئی اس میں محو خواب تھا۔

کون۔۔۔؟ شاید وہ خود یا شاید گیارہویں صدی کا کوئی۔۔۔

پھر ماریے اور تایا ابا کے ساتھ وہ اس وقت کے باورچی خانے میں داخل ہوئے جہاں بڑے بڑے سیاہ دیگچے مصنوعی آگ پر دھرے تھے، پلیٹیں، کیتلیاں اور سامنے کھلی جگہ پر مریدوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ درویشوں کے مجسموں سے تیرہویں صدی کے مناظر کو ان کمروں میں ثبت کیا گیا تھا۔ ان کی نشستیں وغیرہ۔ وہ سب مختلف کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس زمانے کا سادہ پتھر سے بنا فوارہ جہاں سے میوزیم کے کمرے شروع ہوتے تھے وہاں ایستادہ تھا۔ کمرے اتنے چھوٹے تھے کہ جھک کر اندر داخل ہونا تھا۔ قندیلیں، لکڑی کے قلم، بلیڈ جن سے ان کو تراشا جاتا تھا، کیتلی اور پیالیاں، قران پاک کے صحیفے، بڑے حجم کی تسبیحات، پیالے جو بڑے ناریل کو کاٹ کر یا چاندی، تانبے سے بنائے جاتے تھے جس میں درویش نیاز لیتے تھے، نر سنگھا یا قرنا جن کو کسی بستی میں داخل ہونے سے پہلے بجایا جاتا تھا، خاکی رنگ چوغے، لمبی ٹوپیاں، پیٹیاں جنہیں کمر پر باندھا جاتا تھا، ربن جو پہلے دن باندھا جاتا تھا، ہاتھ سے لکھے دستاویزات، اس وقت کے موسیقی کے آلات رباب، دف جھانجھر، زرد صفحوں پر لکھے راگ، شاہی فرمان، سنہرا نوک دار ڈنڈا جس پر اللہ لکھا تھا اور کلاہ نما ٹوپی جو شمس تبریز کی تھی جس پر کلمہ توحید لکھا تھا وہ دیر تک دیکھتی رہی، مولانا روم اور شمس تبریز کی پینٹنگ، قدیم جائے نماز، نشستیں، سلطان ولد کے کپڑے، ان کے ہاتھ سے لکھے مولانا کی مثنوی کے اشعار ان سب کو دیکھنے کے بعد پھولوں کی کیاری کے سامنے سے ہوتے وہ مولانا کے مزار میں داخل ہوئے تھے۔

قبر والی جگہ نیلے، سرخ، سبز رنگوں اور سنہری خطاطی سے مزین تھی۔ قبر کے سامنے ہال تھا جس میں مولانا سے متعلق چیزیں، قرانی صحیفے شیشے کے کیسز میں تھے۔ دائیں جانب جنگلے کے پار ایک کمرہ تھا جو سبز روشنیوں میں ڈوبا تھا۔ لوگوں کا سر سراتا ہجوم اور وہ ان سب سے ماورا۔۔۔ وہ جہاں جاتی تھی اپنے ساتھ کسی اور کے نام سے فاتحہ کیوں پڑھتی تھی وہ انجان تھی اور وہ جو نہ ہو کر بھی وہاں موجود تھا تو کیوں تھا۔

وہ وہاں سے باہر نکل رہے تھے اس نے دیکھا مزار میں تیر کے نشان سے مختلف مسلم ممالک کی نشاندہی کی گئی تھی اور فاصلہ لکھا تھا انقرہ، شام، فلسطین۔۔۔ جاتے سمے اس نے وہاں سے ایک جامنی اور ایک آتشی گلابی پھول چرایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تایا ابا کے ساتھ اسی شام وہ کونیا کی سڑکوں پر نکلی تو بس جس سمت سورج ملا اس سمت چلنے کو کہتی گئی وہ بھی بغیر کچھ

کہے اس کی بات مانتے اس کی وہیل چیئر گھسیٹتے رہے۔شدید سردی میں سورج کی ہلکی تمازت اسے اچھی لگ رہی تھی۔ سورج علم اور بھلائی کو جلا بخشنے والا اندھیروں کو دور کر دینے والا وہ قیمتی پتھر جو آسمان پر ٹانکا گیا ہے۔۔۔وَالشَّمسِ وَضُحَاهَا (اور سورج کی قسم اور اس کی چمک کی) یہ سورج دیوتا کی رتھ تھی جس پر وہ سوار تھی رتھ کو گھوڑے آسمان پر اڑائے لے جا رہے تھے یا شاید وہ ایماتراسوتھی سورج کی دیوی جو کسی غار میں چھپ جانا چاہتی تھی مگر ایمنویوز مے رقص کرتی تھی کہ وہ لوٹ آئے دنیا کو اپنی چھب دکھائے۔وہ دیکھیں تایا ابا سورج تک راستہ بنا ہے اس نے بے اختیار بلند آواز میں کہا تھا۔ جہاز کا دھواں آسمان میں سورج تک سیدھی لکیر کی صورت ٹھہرا تھا۔وہ نم آنکھوں سے مسکرائے وہ یہاں سے جانے کے پر تول رہی تھی۔

"سوموار کے دن وہ دونوں رسی پر چلتے سورج کی طرف چلے گئے۔" سمیع کو میسیج میں اس نے لکھا تھا۔۔۔بک تھیف کے جملے،وہ سمجھ نہیں پایا۔

"کہاں ہو تم؟"

"میں شمس تبریز کے شہر میں ہوں۔۔۔رومی کے شہر میں۔"

"تم کونیا میں ہو۔"اس نے جواب میں سمائلی بھیجا۔

سیاہ کبوتروں کا غول دانہ چگنے میں مگن تھا،دائیں طرف ایک عالی شان عمارت کی مہک ایک قدیم مسجد تھی۔وہ مسجد بھی اسے شمس تبریز لگی تھی،ہاٹل سے شمس تبریز کا مزار زیادہ دور نہیں تھا سو وہ صبح صبح پیدل ہی نکل آئے تھے۔ آج شام کو انہیں پاکستان واپس جانا تھا۔ مسجد کو باہر باہر سے تکتے سڑک کراس کر کے وہ اس قطعے میں داخل ہوئے جہاں شمس تبریز کا مزار تھا۔ آسمان کی اوڑھ دیکھو تو درختوں نے جیسے اس کی دید کا رستہ روکا تھا،سرمئی فرش سردی سے ٹھٹھرتا ہوا وہ قدم قدم چلتی مزار کے سامنے پہنچ گئی دھیرے سے جوتے اتارے۔ در پر ہی اندر کا سارا منظر واضح تھا بعض اوقات اندر اترنا نہیں پڑتا شروع میں ہی ہر منظر واضح ہو جاتا ہے۔۔۔وہ اندر داخل ہوئی بائیں طرف مسجد کا ہال اور منبر تھا اور سامنے سیاہ کپڑے سے ڈھانپی ایک قبر۔۔۔جس کے اوپر شمس تبریز کا کلاہ جس پر کلمہ توحید لکھا تھا لگایا گیا تھا۔ دائیں جانب دروازہ تھا اور بائیں جانب کھڑکی۔ قبر کی پشت کی دیوار پر بھی ایک کھڑکی تھی جس پر سیاہ پردے تھے اور اوپر فریم میں حضرت مولانا شمس تبریز لکھا تھا۔ فانوس سبز تھے اور منبر کا پردہ بھی۔یہ مسجد اور مزار کا ممینیشن کتنا زبردست ہے کہ یہ اللہ کے نیک بندے اور اعلیٰ مرتبوں والے لوگ تھے ان کے علم سے فیض حاصل کرو مگر جھکو تو صرف ایک خدا کے آگے کہ وہ ہی اس کا حقدار ہے ۔اور شمس تبریز اس کے لیے کیا تھا،بچپن کی کوئی فینٹیسی سٹوری جس نے اسے ڈھارس دی تھی نہیں صرف اتنا نہیں تھا۔۔۔ اس کے لیے شمس تبریز علم و محبت کا مرقع تھا کتنی دیر وہ ان کی قبر کے سامنے کھڑی رہی تایا ابا دیکھتے تھے کھڑکی سے چھنکتی آتی کرنیں اس کے

وجود کا احاطہ کر رہی تھیں وہ کائناتی رقص میں شامل ہونے جا رہی تھی اور خود اس سے انجان نہیں تھی۔ وہاں بھی اس نے اپنے نام کے ساتھ کسی اور کے نام کی فاتحہ پڑھی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سیاہ دھرتی اور آسمان کو زرد اور سرخ لکیریں جدا کرتی تھیں افق پر ایک چمکتا ستارہ اس کے ساتھ سفر کرنے لگا۔اس نے گردن موڑ کر تایاابو کو دیکھا وہ محبت سے اسے دیکھتے تھے وہ مسکرا دی۔سیاہی پر نیلاہٹ نے جنم لیا اور بڑھتی چلی گئی ،روشنی بڑھنے لگی۔۔۔نیچے بادلوں کا سمندر تھا۔جہاز کا پنکھ سورج کی روشنی میں دمکتا تھا دور ترکی کے برفپوش پہاڑوں کی چھب دکھائی دی جو پلوں میں غائب ہوئی وہ سب سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پندرہ دن پہلے اس کا انتقال ہوا تھا اور پچھلے پندرہ دن سے وہ مسلسل کمرے میں بند تھا ملاقاتی دروازے پر دستک دے کر چلے جاتے تھے، دودھ والے نے پچھلے تین دن سے آنا بند کر دیا ہے، ڈاکیا بجلی کا بل دروازے کے نیچے سے کھسکا گیا تھا وہ مٹی میں رل چکا تھا۔ پچھلے پندرہ دن کے اخبار ہوا چلتی تو عجب خوفناک سا شور مچاتے تھے۔ ہر چیز پر گرد جمی تھی فرنیچر پر، برتنوں پر اس پر۔ رو رو کے اتنا تھک چکا تھا کہ اب آنسو نہیں آتے تھے شدت گریہ سے محض آنکھیں جلتی تھیں۔نئے آرڈرز کے لیے فون آ رہے تھے وہ بجتے فون کو تکتا رہتا پھر اس نے فون چارج کرنا ہی چھوڑ دیا۔ آج پندرہ دن بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تھا داڑھی کے گنجلک بال سرخ آنکھیں بڑھے ہوئے ناخن مگر آئینہ اس کی یاد دلا رہا تھا اس کی جس نے اسے ہر جذبے سے روشناس کروایا اچھائی، محبت، حسد، لالچ۔۔۔

اب وہ کہیں نہیں تھی اور لگتا تھا ہر کہیں تھی کبھی لگتا تھا اس کا جنازہ وہاں صحن میں رکھا ہے یہ اخباروں کی نہیں اس کے کفن کی پھڑ پھڑاہٹ ہے۔ آج چودہ جولائی بھڑکتی

آگ جیسا دن اور وہ پنکھا نہیں چلا رہا وہ بھی تو اس وقت بغیر۔۔۔

اس نے ہمت ہار دی تھی۔

"میرے دوست نے مجھے دھوکہ دیا ہے لون اپروو ہو گیا، ایپلیکیشن بن گئی تو وہ مجھے بیچ میں چھوڑ کے چلا گیا ہے۔۔۔ میں اکیلا یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔" سمیع نے فون پر اسے کہا تھا۔

"اگر آزمائش، وقت اور تجربے کی اہمیت نہ ہوتی تو نبی اول روز سے نبی ہوتے۔۔۔ یوسف علیہ سلام کو ایک عرصہ غلامی اور جیل کی زندگی نہ کاٹنی پڑتی، موسیٰ علیہ سلام کو مدین میں اتنے سال گزارنے کے بعد طور پر نہ بلایا جاتا، محمد ﷺ کو مکہ سے ہجرت

کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی پھر ہم کس برتے پر چاہتے ہیں کہ جس راہ پر ہم چلیں ہیں اس کی منزل یونہی آسانی سے ہمیں مل جائے بنا مشقت کاٹے بنا اچھے برے تجربات حاصل کیے۔ان مشکلات، ان تکلیفوں پریشانیوں کو تقوٰی سے برداشت کرنے کے بعد خدا حکمت نازل کرتا ہے۔۔۔ علم یقین ملتا ہے۔ہر چیز کو افزائش اور ترقی کے لیے،نمو کے لیے ایک مخصوص وقت چاہیے ۔۔۔پھر راستہ کھلتا چلا جاتا ہے چاہے آہستہ آہستہ کھلے۔روز ایک ایک قدم بھی اٹھایا جائے تو چاہے اندازہ نہ ہو مگر پیچھے نظر ڈالنے پر وہاں جہاں آپ پہلے کھڑے تھے وہ پیچھے نظر آئے گا۔۔۔اگر آگے چل رہے ہیں تو ارد گرد کا منظر لازمی بدلے گا ۔۔۔آگے کا راستہ لازمی بنے گا ۔۔۔ہاں رک جانے والے کے لیے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

وقت پر بھروسہ کیجیے،اسے اُپکی قسمت کو واضح شکل میں لانے کا موقع دیجیے،تب تک صبر اور ہمت سے کام لیجیے۔شیطان انسان کی فطرت سے واقف ہے تبھی وہ اسے جلد بازی پر اکساتا ہے اسے فورًا نتائج نہ ملنے پر مایوس کرتا ہے اور انسان اس عورت کی طرح ہو جاتا ہے جو عرصہ سوت کاتتی ہے اور لمحوں میں اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔۔

ابھی تو بہت شروع کی منازل ہیں ابھی سے ہمت کیسے ہار سکتے ہیں اُپ۔۔۔جس چیز کو وقت دیا جائے وہ چیز بابرکت اور اس کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور وہ لازمی پھلتی پھولتی ہے۔"وہ جواب میں خاموش ہو گیا تھا اسے احساس کیوں نہیں ہوا اسے کا پنچھی آنسو بہاتا اپنے متعلق اس کی آخری گفتگو سن رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ تیمیہ کی ماں سے ملنے آیا تھا تایا ابو کی گزارش کی وجہ سے اسے اجازت مل گئی تھی۔"تم پڑھاتے تھے اسے۔"وہ آہستہ سے بولی تھیں مبادا کسی کے کان میں بھنک نہ پڑ جائے۔

"جی۔"وہ مختصرًا بولا۔

"اس کا ذکر یہاں مت۔۔۔"ان کی بات بیچ میں رہ گئی۔اتنے میں اس کے ابا بھی داخل ہوئے تھے جیسے اس نے بتایا تھا بالکل ویسے تھے۔اس نے میز پر ان کے سامنے چیک رکھا تھا اور ایک کتاب۔

"یہ کیا ہے؟"اس کی کتاب کی اشاعت کروائی تھی میں نے اور یہ اس کا پہلا چیک ہے۔"وہ ساکت تھیں۔

"اس کی بہت خواہش تھی کہ وہ آپ کی خواہش پورا کرے۔"

"مگر میں نے تو۔۔۔"وہ بات مکمل نہیں کر سکیں اس نے شال ان کے سامنے رکھی تھی۔

"یہ اس کی پہلی کمائی میں سے خریدی ہے۔"اس نے جرابیں پہنتے ہوئے کہا۔کمرے میں قالین نہیں بچھا تھا مگر پھر بھی اس نے جوتے جرابوں سمیت اتار دیے تھے۔وہ ان کو ساکت بیٹھا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

باہر جاتے ہوئے نگاہ دائیں طرف اوپر کے پورشن تک گئی جہاں اس کے گمان کے عین مطابق چائنہ روز کھلے تھے۔اس کے کمرے کا آدھا دروازہ دھوپ سے بھیگا تھا اور باقی چائنہ روز سے ڈھکا ہوا تھا۔اس نے بتایا تھا وہ جب بھی کسی بات پر گھبرا جاتی تھی تو چائنہ روز کھانے لگتی تھی ان کی پتیاں وہ تکتا رہا پھر جہاں وہ کھڑا تھا اس وسیع صحن میں اس نے اسے ننگے پاؤں چلتے پھرتے دیکھا ۔میری آنٹی نے کہا تھا کہ یہ جس طرح ننگے پاؤں پھرتی ہے اس کے پاؤں بطخ جیسے ہو جائیں گے۔گھر میں گونجتی اس کی نقرئی ہنسی گونجی جس نے باہر دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

گلابی آسمان پر اڑتا

میں۔۔۔

سبز پرندہ تھی

تمہاری قسمت تھی میں

اک تارہ تابندہ تھی

سراپا رحمت تھی

تمہاری نجات دہندہ تھی

تم نے کیوں دھتکارہ مجھے

تحفہ رب

خوشی کا سازندہ تھی

ادنٰی نہیں تھی میں

میں تو

جنت کا باشندہ تھی

سنو!

جب تم نے مجھے دفنایا

اس وقت میں زندہ تھی

اس کی کتاب کا مسودہ درمیان سے کہیں کھل گیا تھا اور اب کاغذ پھڑ پھڑا رہے تھے۔اس نے گھر آکر آج صفائی کی تھی نہایا تھا اور پھر سارے خط سامنے بکھیر کر پڑھنے لگا۔اب اسے پڑھنا تھا،کاروبار سنبھالنا تھا کہ رات اس نے خواب دیکھا تھا۔ میں نہ کہتی

تھی کچھ ہے جو بہت خوبصورت ہے۔۔۔جو میرے گمان میں تھا میں وہ اب جی رہی ہوں یہاں وقت کی قید نہیں ہے۔۔۔یہاں سب کچھ لا ہے۔اسے وہاں جانے تک یہاں خوش اسلوبی سے رہنا تھا۔

روز ایک ایک خط کا جواب دیتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا اسکی تحریر تتلی بن کر باغ باغ منڈلا رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

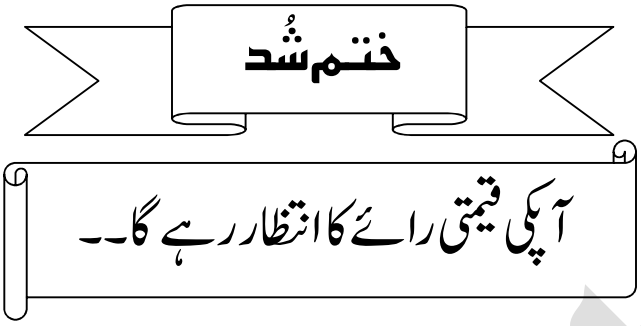


پاک سوسائٹی ڈاٹ کام